غلام محمد احمد

ان بک پبلشرز لاہور

فلسفۂ تاریخ

یعنی

قوموں کی آبادی اور بربادی کے اسباب

جس میں قوموں کی تہذیب و تمدن پر نظر ڈال کر اُنکے عروج و نزول
کے اسباب پر تاریخی حوالجات سے روشنی ڈالی گئی ہے

حصہ اوّل - قوموں کی نقش کشیاں، چیرہ دستیاں اور نبرد آزمائیاں

از

شیخ غلام محمد احمد - ایم - اے - ایم - آر - اے ایل -

بار اوّل　　　تعداد　　　قیمت

اللہ اکبر

دیباچہ

ہر صبح کو یہ شور ہے مرغ سحری کا
چونکو کہ زمانہ نہ رہا بے خبری کا

خدائے برتر کا شکر کس منہ سے کیا جائے۔ کس زبان سے ادا ہو۔ اور کس دل سے نکلے۔ اگر ایک ایک روم کی جگہ لاکھ لاکھ زبانیں بھی ہوں۔ اور ایک ایک زبان سے لاکھوں آوازیں بھی نکلیں۔ اور ایک ایک دل میں لاکھوں خیالات ستائش موجزن بھی ہوں۔ جب بھی اُس کے شکر کا کسی کو منہ نہیں۔ بلبلیں اسکی تعریف کے گن گائیں۔ قمریں کوُ کوُ سے اسکے ذکر کا آوازہ بلند کریں۔ بھانت بھانت کے جانور اپنی اپنی بولیوں سے اسکی تسبیح کی تانیں اڑائیں۔ فکریں دایرہ تخیل میں ہر جانب پرواز کریں اور الوہیت کے بحر بے پایاں میں غوطے لگائیں زبان کی قینچیاں حمد کی کتر بیونت میں ہمیشہ چلتی رہیں۔ قلمیں عاجزی کے مقام میں مصلاء قرطاس پر سر بسجود ہوں۔ اور دواتوں کے منہ محل تحیر میں ہمیشہ کھلے رہیں۔ غرضیکہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ حسن دلبر کا آئینہ وار تعریف و توصیف

کے میدان میں بے پاء و سر مصروفِ کار ہو۔ جب بھی اُسکی ذات و صفات کے اتھاہ سمندر سے ایک قطرہ بھی نہ اٹھا سکیں گے ؎

بَری ہے فکرِ بشر سے صفات و ذات اُسکی
جو آئے فہم میں اپنے تو وہ خدا کیا ہے

دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا۔ سب ہمارے لئے ہوا۔ خود خالق اکبر ہماری خاطر کائینات کے پردے میں رہ کر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے۔ ایک حقیر سے حقیر ذرہ بھی جس کی ہمارے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں۔ ہماری خاطر نظام قدرت کے تحت ایک خاص فرض سر انجام دے رہے ہے۔ سورج اتراتا ہے کہ وہ ساری دنیا میں اُجالا کرتا اور موجودات کو بناتا بڑھاتا گرماتا اور برماتا ہے۔ ذرّہ اس پر چمک اٹھتا اور زبانِ حال سے کہتا ہے کہ میری ہستی ہی تو تیرے وجود کا باعث ہوئی۔ اور کہ کارخانۂ قدرت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں۔ جہاں میرا دور دورہ نہیں۔ گویا ع

ہر ذرہ آفتاب سے کرتا ہے ہمسری

سورج ذرّہ کی اس شوخ بیانی پہ مدھم ہو کر رہ جاتا اور خدا کی دین پر چکر میں آتا ہے دریا بھی اسی رو میں بہے جاتا۔ اور ڈینگ مارے جاتا ہے کہ میں پیاسی کھیتوں اور بستیوں کو سیراب کرتا ہوں۔ قطرہ دریا پہ برس پڑتا اور بول اٹھتا ہے کہ میری ہستی سے ہی تو بنتا اور بہا اوپر آتا ہے۔ پھر یہ تیرے غرور و تکبّر کا مدکیسا اور کہاں کا؟

دریا قطرہ کی اس خشک کلامی پر پانی پانی ہوتا اور خود بخود شرم سے اُترے
جاتا ہے۔ غرضیکہ ع

کوئی شے گلشنِ ایجاد میں بیکار نہ تھی

آسمان ہے تو ہمارے لئے سرگردانی کا دکھ اٹھاتا ہے۔ زمین ہے تو
ہمارے لئے پامالی کا رنج سہتی ہے۔ آفتاب ہے تو ہماری بہتری کے لئے
نکلتا اور چھپتا ہے۔ چاند ہے تو ہماری بھلائی کے لئے گھٹتا بڑھتا اور گہناتا ہے
رعد گرجتے اور بجلیاں کوندتی ہیں تو ہمارے لئے خرمنِ عیش مہیا کرتے ہیں۔ ہوا
و بادل بھی تو ہماری تسکین کی خاطر ہی بھاگے بھاگے پھرتے اور ٹھنڈے
ٹھنڈے جھونکوں اور چھینٹوں سے ہماری بستیوں کو شاداب و سیراب کرتے
ہیں معشوقِ ازلی کی طرف سے تو اس قدر دلداری کہ یہ سب ہماری خاطر
سرگردانی میں ہوں۔ مگر افسوس کہ ہم اسکی دی ہوئی آزادی کی پاسداری
میں پا بہ زنجیر نہ ہوں اور ہماری آہیں اس مقامِ آزمایش اِس منزلِ عشق میں
نالۂ شبگیر نہ ہوں۔ قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ایں ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرمانبردار — شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

ایک طرف تو یہ صورت اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ دنیا میں
کسی شے کو قرار نہیں۔ جو شے آج ہے وہ کل معدوم۔ اور جو کل نابود ہے۔ وہ

پرسوں موجود۔ غرضیکہ حیات و ممات اور وجود عدم کا گورکھ دھندا چلے جا رہا ہے۔ جو ملک آج شاداب و آباد ہے۔ وہ کل خراب و برباد۔ اور جو کل تباہ و برباد تھا۔ وہ پرسوں آباد۔ المختصر دنیا نے اِس قسم کے ہزاروں انقلاب دیکھے۔ اِس طرح سینکڑوں قومیں پھلتی۔ پھولتی۔ پروان چڑھتی۔ اور پھر ادبا کی گود میں سوتی دیکھیں۔ آسمان نے بھی ہزاروں بستیاں اُلٹتی پلٹتی اوپر نیچے ہوتی دیکھیں۔ پھر بھی دنیا کے سہاگ اور آسمان کے رنگ روپ میں ذرا بھر فرق نہ آیا۔ یہ کیوں؟ یہ کس لئے؟ ازل کا بندھا ہوا آئین۔ اور قدرت کا اٹل قانون اِسی طور پر ہے کہ ایک بگڑے تو دوسرا بنے اور ایک بنے تو دوسرا بگڑے۔ ایک اُٹھے تو دوسرا گرے۔ اور ایک گرے تو دوسرا اُٹھے۔ خوشی میں غم اور غم میں خوشی ملی رہے اور اس دنیا کی رونق اور اسکی زیب و زینت اِسی طرح بنی رہے۔ اِس اختلاف سے دنیا کا رنگ پھیکا نہیں پڑتا۔ بلکہ دن بدن دوبالا ہوا جاتا ہے۔ ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن

اے ذوق اِس جہاں کو ہے زیب اِختلاف سے

بزم دنیا کا رنگ پھیکا پڑے تو کیوں؟ اور اسکی سدا بہار میں فرق آئے تو کِس لئے؟ جبکہ جا بجا طرح طرح کی نعمتوں کا خوان لغیما لگا ہوا ہے۔ اور چاروں طرف قسم قسم کی لذتوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ تو بے شک ہمارے لئے

ہے۔ مگر یہ دیکھنا بھی تو ہمارا ہی کام ہے کہ کس نعمت سے کب اور کہاں تک لطف اٹھایا چاہیئے۔ تلذذ حیوانی ہماری عین فطرت ہے۔ لیکن محل و موقعہ دیکھ کر اُس سے تمتع اٹھانا ہمارا اپنا فرض ہے۔ اُس علیم و حکیم نے ہمارے چاروں طرف علوم و فنون کے خزینے بکھیر دیئے۔ لیکن ان سے جواہر ریزوں کو چُننا اور کنکریوں کو پھینک دینا بھی تو ہمارا ہی منصب ہے۔ اُس ربِ حیّ و قدیر۔ اُس واقفِ اسرارِ خفی و جلی نے ہمارے سامنے تیر و تفنگ اور مضراب و چنگ دونو رکھ دیئے۔ اور دونو کے عوائد و فوائد اور ضرر و نقائص بھی جتا دیئے۔ لیکن یہ دیکھنا بھی تو ہمارے ہی متعلق ہے کہ قوم کے لئے تلوارزنی کا مشغلہ چھوڑ کر آلۂ تغنی ہاتھ میں لینا مفید ہے۔ یا کہ جنگی ولولہ کا مظاہرہ کرنا۔ ہمارے سامنے عہدِ عتیق اور عہد جدید کے نظام ہائے حکومت کے مختلف مظاہر کا اور مٹی ہوئی قوموں اور ملتوں کے کارناموں کا چربہ اتار کر رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اِن نظام ہا کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنا اور کھرے کھوٹے کا جانچنا ہماری اپنی وسعتِ نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس ذات بابرکات نے جسکی ہوئیت ہمارے وہم و گمان اور اپنی روز روز کی نت نئی شان سے بھی بہت بلند واقع ہوئی ہے۔ اِس تماشہ گاہِ عالم میں زیست انفرادی کی رنگا رنگ منظر آرائیوں اور حیات قومی کی گوناگوں جلوہ نمائیوں سے ہمارے دِل میں کامرانی کے مختلف طریقوں کا تصوّر پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اِن گورکھ دھندوں سے بچ نکلنا اور اِن

بھول بھلیوں سے عاقبت کی راہ ڈھونڈ نکالنا بھی تو ہمارا اپنا کام ہے۔ اِس لئے یہ کہنا
بالکل بجا و درست ہے۔ کہ یہ دنیا آزمایش کا گھر ہے۔ جہاں افراد و اقوام کے آزمانے
کو نعمتوں اور لذتوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اِن نعمتوں سے لطف اٹھانا اور
پھر اپنے آپ کو بچا بھی لینا اُسی قوم کا شیوہ ہے۔ جس نے ہر شے کو اپنے
محل پر رکھنے کا اصول بھانپا۔ اور اُسے اپنے کاموں کا معیار بنائے رکھا۔
قوم کو ضرور نعمتوں سے لطف اٹھانا چاہیے۔ مگر نہ اس قدر کہ اسی میں ڈوب جائے
اُسے فنون لطیفہ سے بھی کام لینا چاہیئے۔ لیکن نہ یہاں تک کہ انہیں اپنے
تمام کارناموں کا مستنشائے اعظم ہی بنا لے۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں سے تنی بھی رہے
اور کبھی کبھی اُن سے دو دو ہاتھ بھی کرے۔ لیکن نہ اِس طرح کہ خواہ مخواہ اُن کے منہ
آئے۔ اور آئے دن اُن پر ہاتھ صاف کرتی رہے۔ وہ ضرور ایک نہ ایک
وقت طنطنۂ مضراب سے اپنے تارِ حیات کو حرکت میں لاتے۔ لیکن نہ یہاں
تک کہ آلۂ نبرد آزمائی ہی ہاتھ سے نکل جائے۔ اور رشتۂ حیات قومی ہی چھوٹ
جائے۔ وہ بے شک زر و زن سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے
لیکن نہ اِس قدر کہ اُس کا بال بال اِن فرومایہ چیزوں کی محبت میں بندھ جائے
وہ ایک وقت ضرور اپنا نظام حکومت ڈھیلا بھی کردے۔ تاکہ قوم کی جو طنابیں
کھچی ہوں وہ ذرا ڈھیلی ہو جائیں۔ اور لوگ کچھ آرام کا سانس بھی لیں۔ لیکن نہ یہاں
تک کہ نظام ملکی میں ہی ایسی گرہیں پڑ جائیں۔ کہ کھولے سے نہ کھلیں۔ اور

سلجھائے سے نہ سلجھیں۔ گویا افراد کے لئے کیا اور اقوام کے لئے کیا خیر الامور اوسطہا یعنی میانہ روی کی راہ بہترین راہ ہے۔ جو قوم اس راہ کے پہچاننے اور اُس پر جادہ پیما ہونے میں دوسروں سے آگے نکل جائے گی۔ اُسی کے سر ژرف نگاہی اور حقیقت پژدہی کا سہرہ بندھے گا۔

یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ایک وقت ایک قوم کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ مگر جب اُس نے رفتہ رفتہ سر نکالا تو اُس کے یہاں ہُن برسنے لگا۔ پھر تو اُسکی یہ حالت ہوگئی کہ وہ ہوس رانیوں اور تن آسانیوں کی آلائشوں سے آغشتہ اور فنون لطیفہ کی بے جا سرپرستی سے آلودہ ہوگئی۔ اِس وقت دہر کجرفتار نے اُسے ایسا پچھاڑا اور لتاڑا۔ کہ اسکی اٹھان اور گراوٹ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ کیوں؟ یہ اِس لئے کہ اِس سوختہ اختر قوم نے ایک وقت اپنے ارتقا کے تمام اسباب ذہن سے اُتار دیئے تھے۔

قوموں کی بلندی اور پستی کے جس قدر اسباب ہوسکتے ہیں وہ ان اوراق میں گنائے گئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے۔ کہ کس طرح ایک قوم ایک وقت گوشۂ گمنامی میں روپوش ہوتی ہے۔ اور پھر وہ کیونکر بتدریج منازل ارتقا طے کرتی ہوئی منظر تاباں پر آتی ہے اور پھر وہ کس طرح بگڑتے بگڑتے ایسی اوندھی گرتی ہے کہ کسی کو خیال تک نہیں ہوتا کہ یہ بھی کبھی پنپی تھی۔ قوموں کی اِس بلندی کے پانچ بڑے اسباب پائے گئے ہیں۔ قوموں کی مساوات و

حریت نوازی۔ اُن کا اعلےٰ نظام سیاست۔ اُنکی اعلےٰ اخلاقی حالت۔ اُنکی علوم وفنون مفیدہ پر دلدادگی۔ اُنکی اعلےٰ فوجی تنظیم یہ باتیں ہر قوم کو عروج کمال پر پہنچاکر رہتی ہیں۔ انہی باتوں سے قوم نفع رسانیٔ عامہ کے زرین اصول کو اپنے دستور العمل میں جگہ دیتی اور قوائے قدرت کے اعتدال کا مرکز بنتی ہے لیکن برعکس اس کے قوموں کا جبر واستبداد اُن کا بگڑا ہوا نظامِ حکومت۔ اُنکی گری ہوئی اخلاقی حالت۔ اُن کی فنون لطیفہ پر فریفتگی۔ ان کا کمزور فوجی نظام۔ یہ تمام باتیں اُنہیں رسوائے عالم کرتیں اور اُنہیں مٹا کر رہتی ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قوموں کے اخلاق۔ اُن کے نظام سیاست۔ اُن کی دادگستری۔ اُنکی طرز ماندوبود۔ اور اُنکی عسکریت کا باہمی اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ تمام باتیں ایک ہی تمدن وتہذیب کے مختلف اجزاء وعناصر ہیں۔ اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح دست وگریباں ہیں کہ ان کے مجموعی اثر سے ہی قومی حیات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ ان اصول خمسہ کا تجزیہ قارئین کرام ان اوراق پریشاں میں پائیں گے۔

کتاب سر تظور الامم کا اُردو ترجمہ انقلاب الامم شائع کردہ دار المصنفین ہماری نظر سے گذرا۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے انقلاب امم کے موضوع پر ایک خاص زاویہ نگاہ سے نظر ڈالی ہے۔ مگر جو نقطہ نظر ہمارے

سامنے ہے۔ وہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ جن اصحاب نے وہ کتاب بھی دیکھی اور یہ بھی وہ خود بھانپ لیں گے کہ ہمارے اور مصنف موصوف کے درمیان کس قدر وسیع خلیج حائل ہے اور کہ اُن کے اخذکردہ نتائج کو ہمارے اخذکردہ نتائج سے دور کی بھی نسبت نہیں۔

اِس کتاب کے ترتیب دینے میں ہمیں بڑی کدّوکاوش سے کام لینا پڑا اور عہد عتیق و جدید کی تاریخ کو کھنگھولنا پڑا ہے۔ جب بھی حیات ملّی کے اِن پانچ اصولوں کی تائید میں کافی مصالحہ فراہم نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی جسقدر فراہم ہوا ہے۔ اُس سے قارئین کرام کے ذوق طبع کے لئے تفنن کا کافی سامان بہم پہونچے گا۔ غالب ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

سرینگر۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ

احمد جموی

فہرست مطالب

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
رانا پرتاب اور اُس کا جنگی ولولہ		لباس اور کھانا پینا	
نپولین اول کا فوجی ولولہ اور اُس کا عروج ونزول		لہو ولعب	
اسلام کا عروج وزوال اُس کے نظام عسکریت سے وابستہ ہے		فوجی سپرٹ	
جاہلیت کے عربوں کی عادات وخصوصیات		فنون لطیفہ	
خلیفہ ثانی کے وقت کا فوجی نظام		رسول اللہ صلعم کے بعد کیا ہوا	
اقوام عالم کے حالات سے اخذ کردہ نتائج۔		عہد حضرت عثمان رض	
دوسرا حصہ		عہد بنی اُمیہ	
پانچواں باب ۔ امارت وغربت فقر وغنا کا مسئلہ۔		خاندان بنی امیہ کے انحطاط کے اسباب	
شعبہ ہائے حیات کے متعلق اسلام کا زاویہ نگاہ۔		عہد بنی عباسیہ	
کسب معاش		**چھٹا باب** ۔ فنون لطیفہ کی کساد بازاری اور علوم و فنون مفیدہ کی سرپرستی	
مکانات کا بنانا		اسلامیوں کی فنون لطیفہ کیساتھ وابستگی	
		ہندوستان کے مغل شاہان کے خاندان کا دور انحطاط	

تمت

پہلا باب

مقدمہ

دُنیا کی مشہور مشہور قوموں کا انجام۔ خدا کے بھیجے ہوئے بندوں اور سچے عاشقوں سے دنیا کا سلوک۔ فنا کا دروازہ کھلا ہے۔ بہار و خزاں کی تمثیل۔ دلّی کا حال۔ قوم عاد و ثمود کی تباہی۔ قوموں کا مابہ الامتیاز فرعون۔ قارون اور قوم مدین کی تباہی۔ مال و دولت کی کثرت قومی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ پانچ باتیں جو ایک کامیاب قوم میں ہونی چاہئیں:۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
نظر میں ہے ہمارے جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاء پریشاں کا

اے دُنیا! بے وفا دُنیا!! ناپائدار دُنیا!!! تیری کیا کیا کہانیاں۔ کیا کیا

افسانے زبانوں پر ہیں۔ تیری کونسی بات یاد کی جائے اور کون سی بھلائی جائے تیرے ہی افسانوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اور تیرے ہی بچّوں کی مٹی سے تیری زمین کا چپہ چپہ پٹا پڑا ہے۔ کہاں رومۃ الکبریٰ کے وہ جوانمرد جنہوں نے پہلے پہل تیری تھوڑی سی زمین پر اپنے جھنڈے گاڑے اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ تیری ساری بستیوں پر چھا گئے۔ اور اُن کے ایوانِ شکوہ کے کنگرے آسمان سے باتیں کرنے لگے! کہاں وہ افلاطون۔ ارسطو اور اُن کے ہمچشم جنہوں نے تیرے سمندروں سے حکمت کے موتی نکال لیے۔ نہیں نہیں تیرے آسمان سے تارے اُتارے۔ اور تیرے سپوتوں کو آئین جہانداری اور آئینہ گری سکھائی۔ یہ سب تیرے بطن سے پیدا ہوئے۔ تیری گود میں پلے اور تیرے یونان کی حکمت و فلسفہ میں چار چاند لگا کر تیرے ہی آنچل میں روپوش ہوئے۔ کہاں وہ کورو اور پانڈو جنہوں نے حق و باطل کی لڑائی ڈال کر دنیا پر روشن کر دیا کہ سچ آخر میدان جیت کر رہتا ہے جن کی نبرد آزمائی کی دھاک چار دانگ عالم میں بندھی۔ اور جن کی جنگی طاقت کا لوہا سب نے مانا۔ کہاں وہ دیلمی اور کیانی تاجور جن کے سمند اقبال کی رکاب دولت و عظمت نے تھامی۔ جن کے قدم شان و شوکت نے لئے! کہاں وہ کے و جم جن کے جامِ جہاں نما کی چمک نے تیرے سورج کو ماند کر دیا! کہاں سکندر۔ نپولین۔ چنگیز خاں۔ تیمور اور اُن کے

بھائی بند جنھوں نے تیری زمین کو تلواروں سے ناپا اور اپنے جنگی کارناموں سے
چاروں طرف دھوم مچادی! ۔ کہاں وہ بہادر ترکی قوم جس نے تیرے لختِ جگر
صلاح الدین ایسے سپہ سالار کی قیادت میں یورپ وسطی کی قوت کا طلسم
توڑا ۔ اور عساکر اعدا کے دھوئیں اڑائے! کہاں عرب کے وہ جانباز مسلم
جنھوں نے رومی اور پارسی سلطنتوں کے بخیئے ادھیڑے ۔ اور تیرے قلعوں
پر اپنی عظمت وشوکت کے پھریرے اڑائے ۔ جنھوں نے تجھے منہ نہ لگایا
اور تو اُن کے قدموں میں لوٹی ۔ جنھوں نے تیری دولت کو آنکھ اٹھا کر نہ
دیکھا اور تو نے اُن پر زروجواہر نچھاور کئے ۔ اے دنیا! اے ناپائدار
دنیا!! یہ تمام قومیں تیری آغوش میں پھلی پھولیں ۔ اور تیری ہی آغوش
میں موت کی میٹھی نیند سو گئیں ۔ وہ کیا کیا صورتیں تھیں جو تیری ہی مٹی سے
اُٹھیں اور تیری ہی مٹی میں نابود ہوئیں ۔ غالب ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اللہ اللہ! بگڑے مذاق کے لوگوں اور قوموں کے ساتھ جو تمام عمر
دینھم دینار[1] ھم کی مالا جپتے رہے ۔ جو سلوک اے دنیا تو نے کیا ۔ وہ اسی کے

---

[1] ان کا دین دینار یعنی روپیہ ہے ۔ (مصنف)

مستحق تھے۔ مگر تو نے تو بندگانِ خدا اور مردانِ راہ کو بھی نہ چھوڑا۔ حضرت نوحؑ
ابراہیمؑ۔ یونسؑ۔ ذکریاؑ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ۔ سری رام چندر جی۔ حضرت محمدؐ
اور اُن کے بھائی بندسب کو تو نے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اُن پر طرح طرح
کے ظلم توڑے۔ اُن پر تیری مصیبتوں کی کالی کالی اور اُودی اُودی گھٹائیں
جھوم جھوم کر برسیں۔ اور اُن کے جسم و جان پر تیری آفتوں کی بجلیاں
پے در پے چمکیں اور کوندیں۔ نوح علیہ السلام جو اپنے جدا مجد کے بعد
ساری قوم کے باوا آدم تھے۔ تیرے آلام کے سمندروں میں غوطے کھاتے
رہے۔ اور تیری ہوائے غرور کے تھپیڑوں سے جن سے بحرِ حیات میں ایک
طلاطم برپا رہا اپنی قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ بھی نہ بچا سکے۔ تیری زمین تو
انکی ساری قوم کو اس طرح نگل گئی۔ جس طرح اژدر حشرات الارض کو نگل
جاتا ہے۔ اور حضرت نوح کی ساری عمر کی گاڑھی کمائی یہ ٹھیری۔ کہ وہ
مٹھی بھر آدمیوں کو بچا کر اپنے ساتھ کنارہ ایمان پر لے گئے حضرت ابراہیم
آئے تو انگاروں پر لوٹے۔ مگر تیری کٹھالی سے کندن ہو کر نکلے۔ تو نے
تو ان کو آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں جھونک ہی دیا تھا۔ مگر یہ قدرت
کا زبردست ہاتھ تھا۔ جس نے آتش زار کو گلزار اور گلخن کو گلشن کر دیا
اور تاجِ ابراہیمی پر گوہر مقصود جڑ دیا۔ حضرت یونس سے تو نے وہ کی
جو تو نے کسی سے نہ کی۔ انکی قوم کو ان کے پیچھے لگایا۔ اور وہ جان لیکر

بھاگے۔ مگر بھاگنا کہاں کا اور کیسا! ایک مصیبت سے نکلے تو دوسری میں پڑے
تیرے پیٹ سے نکلے۔ تو مچھلی کے پیٹ میں پڑے۔ اور چھٹی کا دودھ یاد آیا۔
تجھ جیسی مکارہ سیارہ سے پالا پڑا۔ کہ ایک دم بھی چین نہ آیا۔ ذکریا آئے
تو تو نے ان کی رگ جان پر آرہ چلایا۔ اور انسانیت کا خون بے دریغ بہایا۔
حضرت عیسےٰ آئے تو تو نے انکی رات کی نیند اور دن کی بھوک اڑا دی۔ تو
ضرور اُن کو سولی پر کھینچتی۔ اگر قدرت کا زبردست ہاتھ انکی مدد کو نہ پہنچتا۔
حضرت موسیٰ آئے تو تو نے ان کا آخر تک پیچھا کیا اور فرعون کو وہ پٹی
پڑھائی۔ کہ وہ تمام عمر تیری آس پر جیتا اور تیرے پاؤں دھو دھو کر پیتا
رہا۔ پھر تو نے اس سے بھی کھلم کھلا اور منہ درمنہ دشمنی کی جس کا اُسے سان
گمان بھی نہ تھا۔ پہلے تو نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر اُسے خس و خاشاک
کی طرح فنا کی رَو میں بہایا۔ پہلے تو نے اُسے ہوائے عیش میں لوریاں دیں
اور پھولوں کی سیجوں پر سُلایا۔ پھر تو نے اُسے کانٹوں میں گھسیٹا اور موت
کی گود میں سُلا دیا۔ موسیٰ کی بھی تو نے وہ خبر لی کہ تمام خلقت کان پکڑتی ہے
قدرت نے اُن کو کچھ نشانیاں قوت و عظمت کی دے رکھی تھیں۔ جن میں
عصا اور ید بیضا کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ مگر تو نے عرصہ تک ان نشانیوں
کو بے نشان کئے رکھا۔ آخر جب اللہ میاں کا حکم پورا ہوا۔ تو پھر تجھے
کیا سانپ سونگھ گیا۔ کہ انکے آگے بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اور انہوں نے

تیری وہ طنا ہیں کھینچ دیں کہ تجھے بھی خدا یاد آیا۔ حضرت محمدؐ آئے تو تو نے
انکی راہ میں کانٹے بچھائے طرح طرح کے جال لگائے اور جب انکی جان پر
بن آئی تو وہ بھاگے بھاگے مدینہ آئے تو نے یہاں بھی اُن کا پیچھا کیا
اور خواہ مخواہ اُن سے لڑائی ڈال لی۔ مگر جب ان کا پلڑا بھاری ہوا تو پھر
تو ایسی ہلکی ہوئی کہ انکے قدموں پر پڑی اور انکے پاؤں میں لوٹی۔ سری
رام چندر جی آئے تو تو نے ان کو دیس نکالا دیا۔ سالہا سال انکو حیرانی
اور سرگردانی میں رکھا۔ راون کو تو نے ایسی انگلی دکھائی کہ وہ راج پاٹ
اور بھگتی سب کچھ بھول گیا۔ اور تیرے ہاتھوں میں پتھر کا مہادیو بنا رہا۔
تو نے اسکے سارے خاندان اور ساری لنکا کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔
اور سارے جہان میں اُسکی خاک اڑائی۔ سری کرشن جی آئے تو تو نے
کوروں اور پانڈوؤں کے درمیان پھوٹ ڈالی۔ اور ساری ہندی قوم کو
لڑا کے چھوڑا۔ اور سب کو زندگی کا تلخ سبق دیا ؎

امیر اس بیوفا دنیا کی صورت پر نہ تم جاؤ
بڑی عیار ہے مکار ہے ظاہر میں بھولی ہے

یہ لوگ تو تھے بڑے عالی مرتبت اور بلند ہمت۔ اسلئے سب یہ کچھ
برداشت کر گئے۔ اور منہ سے ایک حرف تک نہ نکالا۔ ورنہ اگر کوئی اور
ہوتا تو پھر تو اُسے کہیں کا نہ رکھتی۔ کوہکن قیس اور انکے ہمچشم تھے سب

سچی محبت سے بھرپور اور تجھ سے کوسوں دُور۔ مگر تو نے ان کو بھی در در پھرایا۔ اور خاک میں رُلایا۔ وہ تیرے پالے پڑے تو انکی جان کے لالے پڑے تو نے اُن پر ظلم توڑے۔ مگر اُنھوں نے اُف تک نہ کی۔ سچّا عشق اسی کا نام ہے۔ آج جگ بیت گئے۔ مگر انکے عشق کا چرچا زبانوں پر جیسا جب تھا ویسا اب ہے۔ اور لوگ انکی داستانیں سُن سُن کر جھومتے اور سر دھنتے ہیں۔ یہ باغ محبت کے پکھیرو تھے۔ جو اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے۔ نہیں نہیں جنہیں صیاد اجل نے تاک تاک کر مارا۔ تو بے شک ان سچے عاشقوں اور ان اللہ میاں کے بھیجے ہوؤں پر بھی برسی اور خوب برسی۔ اور اُن پر آفات کے تیر خوب چلائے۔ مگر یہ لوگ بھی تو تھے بڑے مست الست۔ انکے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ جتنی تو انکے پیچھے پڑی اتنے ہی وہ آگے نکل گئے۔ اور جب تو نے اُنھیں فنا کا چولا اڑھانا چاہا۔ تو وہ دریائے ہستی سے پار ہوئے اور بقا کے لباس میں نمودار ہوئے۔ دیکھ یہ لوگ کیا سے کیا ہو گئے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہاں! ہاں! کیوں نہ پہنچتے؟ جبکہ وہ ساری عمر پابند محبت ہو کر تیرے غم سے آزاد رہے۔! امیر ؎

ہو کے پابندِ محبت بندِ غم سے چھوٹ جا
ہاتھ دُنیا سے اٹھا کر پاؤں میں زنجیر کھینچ

یہ لوگ تجھ سے اگر آنکھ لڑاتے رہے۔ تو اس لیے کہ نظر پیدا کریں۔
نہ اس لئے کہ تجھ سے اور تیری اولاد سے طرح عداوت ڈالیں۔ تیری طرف
نگاہ اٹھا کر دیکھتے رہے تو اس لئے نہیں کہ تیرے حسن پر لٹو ہوئے جاتے
تھے۔ بلکہ اس لئے کہ یہاں کے عارضی لباس میں رہ کر اور عامیوں کی
سطح پر آ کر معشوق حقیقی کا نظارہ کریں اور دامن مراد گل مقصود سے بھریں
وہ تیرے تیر اس لئے کھاتے رہے کہ اپنے تیر نگاہ سے طائر مقصود
کا شکار کریں۔ اور تیری زمین پر اس لئے بے پا و سر چلتے رہے۔ کہ
اپنے لئے دل و جگر اور سر پیدا کریں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ امیر ؎

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

اے پیاری دنیا۔ اے من موہنی دنیا! تیرے پھولوں کی ایک ایک
پنکھڑی اور تیرے نونہالان چمن کی ایک ایک پتی یہ حقیقت آشکارا
کئے دیتی ہے۔ کہ تو نے سوچ سمجھ والوں کے لئے جا بجا حکمت کا ایک
بے پایاں دفتر کھول رکھا۔ اور آنکھ والوں کے لئے چپہ چپہ پر عبرت کا
ایک بے بہا گنجینہ دفینہ کر رکھا ہے۔ جبھی تو تو نے پچھاڑ لتاڑ کا وہ تانتا

باندھ رکھا ہے جو کبھی ٹوٹنے کا نہیں اور تباہی و بربادی کا وہ قانون جاری کر رکھا ہے جو کبھی مٹنے کا نہیں۔ مگر اے مادر گیتی! اے مادر ہیر زال! تو بھی کیا کر سکتی ہے۔ جبکہ حامیان مدوجزر اور کارکنان قضا و قدر نے دائرہ امکان کے اندر فنا کا دروازہ کھول رکھا اور سب تجھے خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے ایک وقت ایک قوم بنتی اور ابھرتی ہے اور اپنا وقت پورا کر کے مٹ جاتی اور کچھ عرصہ کے لئے مٹ جاتی ہے۔ اسی کے مٹتے ہوتے آثار پر دوسری قوم کی حیات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اور وہ اپنے وقت میں آسمان شہرت پہ نیر نیمروز بن کر چمکتی اور پھر وہ بھی دیکھتے دیکھتے غروب ہو جاتی ہے زمانہ اس حقیقت کو آغاز دنیا سے دہراتا رہا۔ اور جب تک دنیا ہے دہراتا رہے گا۔ اور قومیں بن بن کر بگڑتی رہی ہیں۔ اور بگڑتی رہیں گی۔ اور فنا و بقا کے اس اٹل قانون کے آگے سر تسلیم خم کرتی رہی ہیں اور کرتی رہینگی۔

اے مصحفی ہیں رو دل کیا اگلی صحبتوں کو

ان بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

زمانے کے اس تغیر و تبدل۔ وقت کے اس ہیر پھیر کو ہم بہار و خزاں سے تعبیر کر سکتے اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ سدا بہار کسی چمن پر نہیں رہتی۔ آج جہاں بہار ہے تو کل وہاں ضرور خزاں ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ ایک قوم نے ایک وقت اپنی ساری کائنات سے ایک باغ بنایا۔ سجایا۔ اور اس میں طرح طرح

سے گل بوٹے لگائے ۔ اور بارہ دریاں بنائیں ۔ اس باغ میں گلاب کھلا ۔ چنبا کھلا ۔ موتیا کھلی ۔ اور طرح طرح کے دوسرے پھولوں نے اپنی اپنی بہار دکھائی اب جب خزاں کی آمد آمد ہوئی ۔ تو دغدغاتا ہوا گلاب ۔ چمکتا ہوا لالہ ۔ دہکتی ہوئی چنبیلی اور مہکتی ہوئی موتیا سب نابود ہو گئے اور باد خزاں نے انکی پنکھڑی پنکھڑی صحن چمن میں بکھیر دی ۔ آہ ۔ امیر ؎

نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

یہ یاس انگیز سماں کچھ عرصہ چمن پر رہا ۔ پھر جب بہار آئی ۔ تو وہی چہچہے وہی قہقہے ۔ وہی بلبل اور وہی اسکی نوا سنجیاں ۔ وہی قمری اور وہی اسکی کوکو ۔ وہی ہزار داستان اور وہی اسکی غزل خوانیاں ۔ غرضیکہ پھر پہلا سا نقشہ جم گیا ۔ اور صحنِ چمن میں وہی پہلی سی گھما گھمی اور چہل پہل ہوتی ۔

بحر ؎ پھر بہار آئی نشہ گل کا تجمل ہو گیا
غنچے چٹکے جانور چہکار اُٹھے غل ہو گیا

اگر یہ باغ زمانے کی دستبرد سے بچا رہا ۔ تو پھر یہ سلسلہ بہار و خزاں کا اسی طرح چلتا رہا ۔ لیکن اگر یہی باغ کسی ظالم ہاتھ سے تباہ و تاراج ہو ۔ اسکی دیواریں گر گئیں ۔ عالیشان بارہ دریاں ڈھنڈار ہوئیں ۔ اسکی اینٹ سے اینٹ بج گئی ۔ اب یہ سارا باغ زمین کے برابر تھا اور اس میں گھے

کے ہل پھر گئے تھے۔ جہاں کسی وقت تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ آج وہاں اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ بس یہی حال قوموں کی آبادی اور بربادی کا ہے۔ کوئی قوم بہار و خزاں دیکھ کر نشیب و فراز بھگت کر۔ رنج سہ سہ کر اپنا وقت نکالے جاتی ہے۔ اور کوئی ایک دو موسم اور کوئی ایک ہی موسم دیکھ کر اور ایک ہی وقت کا دکھڑا پیٹ کر ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے۔ امیر؎

فنا ہے حسن کو دولت کو زندگانی کو
جہان میں نہ کوئی باغ بے خزاں دیکھا

اِس باغ جہاں کی آبادی اور بربادی کی کئی صورتیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں ہر کسی ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھو ہر جگہ یہی مرنے جینے گرنے اُٹھنے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا نہ رکنے والا سلسلہ دکھائی دیگا۔ دور کیوں جاتے ہو دلّی کو ہی لو۔ دھوپ چھاؤں کا جو منظر دلّی میں نظر آتا ہے رُوئے زمین پر اور کسی جگہ نظر نہ آئے گا۔ دلّی ہندوستان کی جان اور حکومت کی کان ہے۔ مگر یہ جان کئی دفعہ نکلی اور کئی دفعہ پڑی۔ یہ کان کئی دفعہ بگڑی اور کئی دفعہ بنی۔ اِسے ہند کا بہترین تاریخی شہر کہنا چاہیے۔ یہاں قدم قدم پر تاریخی آثار مٹے پڑے ہیں۔ اور اب بھی زائرین دور دور سے آکر اسکی روٹھی ہوئی شان و شوکت اور اسکی بچھڑی ہوئی عظمت کے کھنڈرات دیکھتے اور اسکی صدیوں کی مٹی ہوئی سلطنتوں اور

قوموں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دلّی! پیاری دلّی! من موہنی دلّی! تیری خاک پاک سے کیا کیا ہستیاں اٹھیں اور پھر تیری ہی خاک میں مل گئیں۔ تیری زمین پر کیا کیا قومیں کھیلیں کودیں اچھلیں اور پھر تیری ہی خاک میں موت کی گہری نیند سو گئیں۔ تیرے ہی افق سے کیا کیا چاند و سورج نکلے اور چمکے اور پھر تیرے ہی آنچل میں مدھم ہو کے چھپ گئے۔ تیری اس تھوڑی سی زمین پر کیا کیا باغ تہذیب و تمدن کے پھلے پھولے اور پھر خود بخود نیست و نابود ہو گئے۔ امیر؂

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

غرضیکہ تیری زمین کا ایک ایک چپہ تاریخ کا ایک بے پایاں دفتر اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ایک وقت وہ تھا۔ جبکہ کورو اور پانڈو تیرے لیے تیری خاک پاک پر لڑ مرے۔ اور آخیر تیرا نام ساری دنیا میں روشن کر کے چھوڑا۔ راجپوت قوم کی تہذیب کا گہوارہ راجپوتانہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سات سوا سات سو سال کا عرصہ ہوا ہو گا کہ راجپوتوں نے جن کے ایک مقتدر خاندان کا سپوت پرتھی راج ہوا ہے۔ تجھ سے اپنی جانیں لڑا رکھی تھیں۔

اور تیری زمین پر مرنے مارنے کے لئے ہمیشہ طیار رہتے تھے۔ ان کے بعد غوری خاندان کے فرمانروا آئے تو انہوں نے بڑے غور و فکر سے تیری ہی زمین پر حکومت کی داغ بیل ڈال کر اپنی سلطنت کی عمارت اُٹھائی۔ خاندان غلامان کے حکمران آئے۔ تو انہوں نے تیری ہی غلامی کو اپنی حکومت کا طرۂ امتیاز سمجھا۔ اور تیری ہی زمین پر اپنے اونچے اونچے نشان کھڑے کئے۔ جو اب بھی میناروں اور دوسری عمارتوں کی شکل میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ خلجی آئے تو وہ بھی تیری ہی خاک پاک میں لوٹے۔ اور انہوں نے اِدھر اُدھر سے حسن کی پتلیاں اکٹھی کر کے تیرے ہی محلوں کی رونق بڑھائی۔ تغلق۔ لودھی اور سوری آئے تو وہ تیری ہی زمین پر اپنے اونچے اونچے کوٹلے عمدہ عمدہ سڑکیں اور بڑی بڑی سرائیں بنا کر اپنا اپنا نشان چھوڑ گئے۔ چنگیزی آئے تو انہوں نے تیری ہی گز بھر زمین پر ملک گیری اور جہانداری کے جال بچھائے۔ اور اپنی آئین نوازی کی دھاک چاردانگ عالم میں بٹھائی۔ انہوں نے تیری ہی زمین پر سر بفلک محل۔ قلعے اور مسجدیں بنائیں۔ شاہجہان کا مشہور عالم لال قلعہ جسے دلّی والے قلعہ مُعلّیٰ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور جس کے پاؤں ایک وقت جمنا کی لہریں چومتی تھیں۔ تیری ہی زمین پر استادہ آسمان سے سرگوشیاں کر رہا ہے ہندوستان کی بہترین مسجد جسے لال مسجد بھی کہتے ہیں۔ تیری ہی سرزمین پر

کھڑی اپنے بنانے والوں کے نام پر خطبہ پڑھ رہی ہے۔ یہ نشان تو ان جہانکشا لوگوں کے اب تک بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ خود مٹ کر ایسے بے نشاں ہوئے کہ محفلوں میں اُن کا حال سُن سن کر شمعیں تک رو دیتی ہیں۔ امیر ؎

جو بڑے بڑے تھے جہانکشا اُنہیں کیا فلک نے مٹا دیا
نہ عروجِ چترِ شہی رہی نہ ضیائے تاج زری رہی
یہیں کے سارے کرشمے تھے جو یہاں سے آگے وہ بڑھ گئے
نہ ثمر نہ بے ثمری رہی نہ اثر نہ بے اثری رہی

اِن کے جانے کے بعد بھی تیری بیل منڈھے چڑھی۔ اور تو اِس وقت بھی تو اِس عالی ہمت قوم کا دارالسلطنت بنی بیٹھی ہے۔ جس کی زمین پر سُورج غروب نہیں ہوتا۔ اور جو دنیا کے پانیوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ پرانی دلّیوں کی زیب و زینت تو پرانے لوگوں سے تھی۔ اور اب نئی دلّی کی زینت اِن نئے لوگوں سے ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی جدت طرازی سے نہ ٹلے۔ اور انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کے جھنڈے تیری زمین میں گاڑ ہی دیئے۔ اے پیاری دلّی! اے عالی نژاد دلّی! اے آنکھوں کا تارا دلّی! تو کئی دفعہ مری اور کئی دفعہ زندہ ہوئی۔ تو کئی دفعہ بگڑی اور کئی دفعہ بنی۔ تیرا سہاگ کئی دفعہ لٹا۔ اور تجھے کئی دفعہ عروسی کا لباس پہنایا گیا۔ مگر ایک

تو ہے کہ تیرا حسن دن بدن نکھرے جاتا ہے۔ اور تیری رونق بڑھے جا رہی اور تیری ہوا بندھے جا رہی ہے۔ تیری ہر چال ہر ادا میں ایک نہ ایک بات چھپی ہوتی ہے۔ ؎

کہو تو کیوں ہے یہ بننا سنورنا
میری جاں جان لوگے کیا کسی کی

دُنیا میں سینکڑوں قومیں ایسی گذر چکی ہیں جن کے عزو شکوہ کا جھنڈا رُبع مسکون کی بلندیوں پر لہراتا رہا۔ اور اُن کا نعرۂ تعلّی اور غلغلۂ ملک گیری فضائے عالم میں صدیوں گونجتا رہا۔ اُنھوں نے خود سعادت مندی کے آغوش میں تربیت پاکر شاہراہ ترقی پر جادہ پیمائی کی۔ اور اوروں کو بھی اس شاہراہ پر رہنمائی کی۔ آج وہ قومیں کیا ہوئیں؟ انکی تہذیب و تمدن کے آثار جا بجا مٹے پڑے ہیں۔ انکی فنا اسبات پر گواہ ہے کہ وہ اپنی عاقبت نااندیشی سے کسی نہ کسی وقت ایک غلط دھرے پر جا پڑیں۔ اور انکی محیّر العقول ہمت اور فوق العادت عزمیت نے عرصہ تک قدرت کی قہرمانی قوتوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب مقابلہ و مقاتلہ کے تمام حربے بیکار ہو گئے۔ تو پھر وہ موت کی نیند سلا دی گئیں۔ ایک طرف انکی رفعت کی جان گسل جد و جہد اور دوسری طرف انکی گراوٹ کی بے پایاں افتاد دیکھ دیکھ کے اچنبھا ہوتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ ان باتوں کا پتہ لگایا

جائے۔ جو اپنے اپنے وقت میں انکی بلندی اور پستی کی تہ میں تھیں۔ اِس لئے ہم تاریخ اقوام پر چھپلتی ہوئی نظر ڈالتے ہیں۔

عاد کی قوم نوحؑ کی قوم کے بعد قدیم تہذیب کی بانی مبانی سمجھی جاتی ہے عرب و مصر انکی تہذیب و تمدن کے جولانگاہ تھے۔ اس کا زمانہ کوئی چار ہزار قبل مسیح تھا۔ عراقِ عرب میں شہر بابل کے کھنڈرات اِسی قوم کے مٹے ہوئے آثار ہیں۔ یہ شہر بھی ایک وقت عہد عتیق کی مشہور ترین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ سکندر اعظم بھی جسکے اقبال کے ساتھ کسی شاہسوار کا اقبال لگا نہ کھا سکا۔ اسی شہر کو اپنا دار السلطنت بنانے کی آرزو میں مرگیا۔ آج یہی پری پیکر شہر جس نے کسی وقت ساری دنیا پر اپنے حسن و خوبی کا جادو ڈال رکھا اور بڑے بڑے شہواروں کو شیشے میں اتار رکھا تھا۔ ایسا ویران اور سنسان پڑا ہے کہ انسان سناٹے میں آجاتا ہے۔ اس کی رعنائی کا حال پڑھ پڑھ کر اب بھی رنگین مزاج لوگ تڑپ تڑپ جاتے اور اسکے دور عیش کے افسانے سن سن کر پیمانے چکر میں آتے ہیں۔ شاید استاد امیر اسی کے حق میں کہ گئے ہیں ؎

موسمِ گل میں چمن کیسا پری میخانہ تھا
پھول جو تھا وہ کسی محبوب کا پیمانہ تھا
پھول جس گھر میں چنے جاتے تھے اب ہوتے ہیں پھول

آج وہ ماتم سرا ہے کل جو عشرت خانہ تھا
پھول بھی تھے پھل بھی تھے اِس سرا میں کیا نہ تھا
آج ہے ویراں کبھی آباد وہ ویرانہ تھا

اِس قوم کو باری تعالےٰ نے ہر طرح کی نعمتیں دے رکھی تھیں۔ باغ چشمے اولاد۔ اموال۔ دولت وحکومت یہ سب چیزیں ان کے قدموں میں لوٹے جاتی تھیں۔ انکے چشمے چاندی اُبلتے اور انکی زمینیں اور باغ سونا اگلتے تھے اُن کے محل آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ دنیا کی سطوت وحکومت انکے قدم لیتی اور انکی اولاد انکے اگلوں کی روایات پر جان دیتی تھی۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہوگا جہاں انھوں نے جی بھر کر ارمان نہ نکالے ہوں۔ اِن سب پر زمانہ نے عرصہ تک چپ سادھ رکھی اور جب اتمام حجت ہو چکا تو پھر ان کی لن ترانیوں اور حد سے بڑھی ہوئی نافرمانیوں کی وجہ سے کارکنان قضا وقدر جو ابتدا سے انکی موافقت کا دم بھرتے رہے تھے۔ اب اُنھیں آنکھیں دکھانے اور انکی مخالفت پر آستین چڑھانے لگے تھے۔ اب وہ کیسے پنپ سکتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب جو مصیبتیں اُن پر ٹوٹیں۔ اُن سب کی تہ میں انکی ثروت وامارت کام کئے جا رہی تھی۔ اولاد اور حکومت کو چھوڑ کر باقی تمام قسم کی نعمتیں فراواں سیم وزر کی مختلف صورتیں ہیں۔ حکومت بھی ایک طرح زر وسیم کی ہی لونڈی ہے۔ کیونکہ جو

خود خالی ہاتھ ہونگے۔ وہ دوسروں پر کیا ہاتھ رکھیں گے۔ املاک زرعی و ارضی کا ہاتھ تلے ہونا حکومت ملکی کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اور یہ املاک بھی تو بجائے خود کثرتِ زر کی ایک صورت ہیں۔ باقی رہی اولاد۔ افلاس کیحالت میں اولاد کی پرورش ہی نہیں بن پڑتی۔ اور اولاد بھی اُسی وقت اچھی لگتی ہے۔ جبکہ انسان مال و دولت میں کھیلے اور ناز و نعمت میں لوٹتے جاتا ہو۔ اونچی اونچی عمارتوں کا اٹھانا بھی تو روپیہ کا ہی کھیل ہے۔ اور ایسی عمارتیں وہاں ہی نظر آتی ہیں جہاں مال و دولت کی ریل پیل ہو۔ جبھی تو ظاہر ہے کہ مال و دولت کی بہتات نے اس قوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس نے جو قدرت کی آبیاری سے ایک باغ بنایا اور سجایا تھا۔ دستِ گلچیں نے خزاں کے آتے ہی اس کا ایک ایک پھول چن چن کر توڑا اور نوجوانانِ چمن میں سے ایک ایک کو گرا کے چھوڑا۔ امیر ؎

کہو اشجار سے اک دن خزاں بھی آنے والی ہے
اٹھائیں سر نہ اتنا باغباں کی آبیاری پر

قوم ثمود عرب کے مغربی اور شمالی حصے میں جسے ان دنوں وادی القریٰ کہتے تھے آباد تھی۔ اس قوم کا آخری زمانہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانہ سے کچھ ہی پہلے تھا۔ اس قوم کی سدھار کا کام حضرت صالح ؑ کے سپرد تھا۔

اس قوم کی خصوصیتوں میں سے ایک اس کا بڑھا ہوا ذوقِ تعمیر تھا۔ یہ لوگ پہاڑ کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے مکان بناتے۔ میدانوں میں اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کر دیتے۔ اور جتنے اوپر جاتے اتنے ہی نیچے آتے تھے۔ اہلِ تحقیق کے یہاں یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ ہر ایک قوم کے تمدن کا مبدا اس کی اخلاقی ذہنیت یا روح ہے۔ اور یہ ذہنیت یا روح کہیں سالہا سال میں جاکر پیدا ہوتی ہے اس ذہنیت کے ساتھ قومی دولت و حشمت کو بھی ایک گہرا تعلق ہے۔
ایک قوم جب گری ہوئی حالت سے اٹھنے لگتی ہے۔ تو بہت سی منزلیں لپیٹ کر آسمانِ عروج کا تارا بنتی اور انجمن اقوام میں چمک اٹھتی ہے۔ پستی سے بلندی کی طرف جانے میں اگر اسے صدی پون صدی کا وقت لگ جائے۔ تو یہ معمولی بات ہے۔ ایک شخص کا ڈوب کر ابھرنا تو دنوں کی بات ہوتی ہے۔ مگر ایک قوم کا گر کر اٹھنا سالہا سال کا کھیل ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم تھوڑے ہی وقت میں یہ تمام کٹھن منزلیں نکال لے۔ تو یہ اس کی سعادتِ ازلی کی دلیل ہے۔ جاپان کا افقِ دنیا سے نمودار ہونا اور سپہرِ کمال پر چمکنا ابھی کل کی بات ہے۔ مگر کوئی پوچھے کہ اس میں وقت کتنا لگا۔ تو ایک ظاہر بین جھٹ سے کہہ دے گا۔ کہ کوئی دس بیس سال۔ مگر ایسا قول عامیوں کے کلام کی طرح پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ کیونکہ ذہنیت یا روح جس سے قوم کا نظامِ اخلاق وابستہ ہوتا ہے۔ سالہا سال میں بنتی

سالہا سال میں بگڑتی ہے۔ یوں دکھائی تو یہ دیتا ہے۔ کہ مشرق کی اس مشعل بردار ہستی کا یہ سارا تمدنی اور اقتصادی عروج کوئی بیس تیس سال کا کھیل ہوگا۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے۔ تو پھر یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ اس کی داغ بیل بہت پہلے سے پڑ چکی تھی۔ اس داغ بیل پر عمارت کو اٹھاتے اٹھاتے کوئی پچاس ساٹھ سال کا عرصہ لگ گیا ہوگا۔ قوم جب ابھرنے لگتی ہے۔ تو اس کا قومی شعار سپاہیانہ روح سادہ اور محنت کش طریق زیست ہوتا ہے۔ اسی لئے تو اس کی ساری قومی خصوصیتیں اس کے ارتقا کی تمام منزلوں میں اس کا ساتھ دیتی اور اس کے دور عروج میں خود بخود ابھرنے جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قوم کا صعود کمال پر آپہونچتا ہے اور وہ یہاں پہنچ کر خود بخود رک جاتی ہے۔ قوم کی امتیازی باتیں بھی اپنے آپ کو وہاں بھٹا لیتی ہیں۔ قوم جب زندگی کے تمام شعبوں میں اس عروج کے طفیل پروان چڑھتی ہے۔ تو صدی دو صدی۔ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک اس کے فیوض کی گنگا بہتی رہتی ہے۔ مگر جب اس کا رخ مال و دولت کی کثرت سے تعیش کی طرف ہونے لگتا ہے۔ تو پھر اس کے نظام سیاست میں بھی فرق آنے لگتا۔ اور فنون لطیفہ کی اشاعت کا زور ہونے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انحطاط کا یہ دور پورے زور سے شروع ہو جاتا ہے۔ فنون لطیفہ کی بنیاد بھی اسی وقت پڑتی ہے۔ جبکہ سپاہیانہ عادات

اور سادہ زیست سے منہ موڑ کر تن آسانی اور عیش پرستی کو دل میں جگہ دینے لگتی ہے۔ قوم کے اس دور حیات میں اُن خاص خاص فنون لطیفہ کو فروغ ہوتا ہے جن سے اُسے وابستگی پیدا ہو چلی ہو۔

قوموں کا ما بہ الامتیاز اُن کی اخلاقی ذہنیت ہے۔ کسی قوم کا معیار اخلاق جتنا زیادہ بلند ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ وہ عزت و ترقی سے ہمکنار ہوگی۔ اخلاقی روح ذیل کی نمایاں باتوں سے پیدا ہوتی ہے:

(الف) اسلاف کے کارناموں کا اثر۔

(ب) تربیت کا اثر۔

(ج) مذہبی اور ملکی لیڈروں کا اثر۔

(د) ماحول کا اثر۔

(ہ) ملکی ہیئت اور آب و ہوا کا اثر۔

قوموں کے بننے اور بگڑنے میں ان باتوں کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ قوم کے افراد کی جبلی صلاحیت اور فطری قابلیت کا بھی ایک حد تک محتاج ہوتا ہے۔ یعنی جس قوم کے افراد میں ضبطِ نفس، عزم اور ارادہ کے ملکات فاضلہ بحیثیت مجموعی قوی ہوں گے ان پر اوپر کی باتوں کا اثر نہایت صحت بخش ہوگا۔ جو قوم عام طور پر ایسے قوی الارادہ افراد پر مشتمل ہوگی۔ وہ اپنی ہمعصر قوموں میں ممتاز رہے گی۔ جس قوم میں ضبطِ نفس کا ملکہ اچھا

ہوگا۔ اس پر دواعی شہوت کا اثر بہت کم ہوگا۔ اور جس میں یہ ملکہ نہ ہوگا۔
یا کم ہوگا۔ اس پر ان کا اثر ضرور ایک نہ ایک وقت ہو کر رہے گا۔ مال و دولت
کے پیچھے پڑنا اور آز و حرص کی دیوی کے آگے جھک جانا دواعی
شہوت سے مغلوب ہونے کا ایک زبردست مظاہرہ ہے۔ مال و دولت
کی بہتات ایک نہ ایک وقت قوم کے ضبط نفس کا رشتہ ڈھیلا کر ہی
دیتی ہے۔ اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ قوم اپنے ذاتی خصائص چھوڑنے
اور فنون لطیفہ کی طرف جھکنے لگتی ہے۔ فن تعمیر کو فنون لطیفہ میں ایک
نمایاں درجہ حاصل ہے۔ قوم ثمود کو اس فن میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس فن
کی بابت ان کی توجہ ان کی خوش حالی اور فارغ البالی پر محض شہادت ہے۔ یہ
قوم یہی سمجھے رہی۔ کہ اس سے بڑھ کر کس کا ہاتھ اونچا ہوگا۔ اور کس کا حوصلہ
ہوگا۔ کہ اس پر منہ آئے۔ اور اسے نیچا دکھائے۔ مگر اس کو معلوم نہ تھا۔ کہ
قدرت کا ہاتھ سب ہاتھوں سے اونچا ہے۔ اور کہ دنیا کی کوئی طاقت ایسی
نہیں جو اسے روک سکے۔ اس قوم نے اسی گھمنڈ پر اپنی دستکاری کے اعلیٰ
نمونے اونچے اونچے محلوں اور مکانوں کی شکل میں کھڑے کر دیئے۔ اور
اس طرح اپنی امارت کی دکان بھی اونچی چن دی۔ مگر جب اس کے رخصت
ہونے کا وقت آیا۔ تو پھر یہ صفحۂ ہستی سے حروف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ اور
اس کے محلوں کی ایسی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ کہ کبھی ان کے مٹے ہوئے

آثار پر سالہا سال آنسو بہایا کریں۔ انیس ؎

امیر ایسا کیا ویران اجل نے ان مکانوں کو[1]
کہ آنکھیں رکھ کے روتی تھیں ایک ایک روزن پہ

کھیتی باڑی، باغ بغیچے، محل، یہ سب چیزیں امارت اور دولت مندی کے آثار ہیں۔ ثمود کی اس دولت مندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدائے جبّار کی خدائی سے سرتابی کرنے اور حضرت صالح کو مسحور کہہ کر ان کی کھلّی اڑانے لگے۔ اس قوم میں نو آدمی فتنہ و فساد کی جڑ تھے۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو اوروں سے دولت و حشمت میں کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ اس امارت و ثروت کی وجہ سے ان کی آنکھوں پر پٹّیاں بندھ گئیں اور غرور بھر گیا۔ اور ان کی خودی خود بینی اُن کا نام و نشان تک مٹا کے رہی۔ اکبر ؎

بھلا ہی دیتی ہے جس کو دنیا مٹا ہی دیتا ہے جسکو گردوں
عبث ہے انسان چاہتا ہے جو نام ایسا نشان ایسا

فرعون کی قوم کو بھی اڑھائی ہزار سال ہوئے مصر میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ اس قوم کے وطنی بادشاہوں کا خاندانی لقب فرعون تھا۔ حضرت نوح

---

[1] یہاں تصرف کیا گیا ہے مصرع اصل میں اس طرح پر ہے۔ ع۔
امیر ایسا کیا ویران اجل نے قصر شاہی کو

کے دو بیٹے حام اور سام تھے۔ قوم فرعون حام کی طرف منسوب ہے۔ اور بنی اسرائیل سام کی طرف۔ قوم بنو حام عنانِ حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے تھی۔ اور بنو اسرائیل غلامی کا جوا گردن میں ڈالے ہوئے تھی۔ بنو حام مال و دولت میں لوٹے جاتی تھی۔ اور بنو اسرائیل کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ بنو حام کے سر پر ایک جن تو حکومت کا سوار تھا۔ اور دوسرا دولت کا۔ ذوق ؎

نشۂ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے اور بھی شیطان چڑھا

اسی لئے فرعون کی قوم بنی اسرائیلیوں پر جہاں تک اُس کا بس چلتا ظلم و ستم توڑتی۔ اور انہیں کسی پہلو چین نہ لینے دیتی تھی۔ انکے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتارتی۔ اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رکھتی۔ لڑکے ظلم و تعدی کی تہ میں جو شئے دبا کر کام کئے جا رہی تھی۔ وہ انکی امارت تھی۔ اگر اُن کے یہاں ہُن نہ برستا ہوتا تو یہ کبھی نہ اکڑتی۔ اور خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آگے کبھی سر نہ اٹھاتی۔ خالی ہاتھ لوگوں کی حکومت کیسی اور کہاں کی؟ حکومت کا رعب و داب تو مال و دولت کی کثرت میں مرکوز ہوتا ہے۔ جس قوم کا زر وسیم کی بہتات کے ساتھ ساتھ ملکی وسعت کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ اوروں کے آگے کبھی نہ جھکے گی۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ فرعون اور اس کی قوم کی یہ چیرہ دستیاں دستم ریزیاں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے خلاف تمام صف آرائیاں و جنگ آزمائیاں فراوانی زروسیم اور کثرت اموال واملاک کے بل پر تھیں۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ یہ سطوت و جبروت یہ دولت و غرور اِس قوم کو ہمیشہ کے لئے لے ڈوبے۔ آسمانی کتابوں میں ہے کہ جب بنی اسرائیل اپنے وطن سے راتوں رات بھاگ نکلے۔ تو ان کے دل ڈوبے جاتے تھے۔ کہ دشمن اب آیا کہ آیا۔ مگر کسی کو کیا معلوم تھا۔ کہ قہر الٰہی کا دریا اب ٹھاٹھیں لے رہا ہے۔ اور اِس قوم کا جنازہ اُتارنے کے لئے پانی کی ساری دنیا چشم براہ ہے۔ کیا۔ امیرؔ

مہمان ایک آن کی تھی آن حسن کی
اتنی سی بات پر تمہیں اتنا غرور تھا

فرعون اپنی سرمایہ داری۔ حشمت افروزی اور جہانداری کے بل پر انسانیت کے جامے سے نکل کر خدائے جبّار کے کالبد میں آنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ہوا باندھنے کو بہتیرے جتن کئے۔ ہزاروں چالیں چلیں۔ لاکھوں داؤ کھیلے۔ لیکن اس کی سطوت کا افسوں موسوی قوم پر نہ چلا پر نہ چلا۔ اور سحر سامری۔ دعائے نیم شبی اور جادوگری سب اکارت گئے۔ وہ تو موسوی قوم پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ مگر اُسے شان وگمان بھی نہ تھا۔ کہ وہ اپنے ہی گھر میں مار آستین پال رہا۔ اور دوستی کے لباس میں دشمن تیار کئے جا رہا ہے۔ امیرؔ

عجب ہے رسم جہانِ پرفن کہ دوست سمجھتے ہیں جی کے دشمن
چھپاتے جس کو کہ زیرِ دامن وہ سانپ بنتا ہے آستیں کا

آخر موسیٰ علیہ السلام نے سب کو ایک لاٹھی ہانکا۔ اور فرعون کے جادوگروں کی ساری جادوگری مات کردی۔ فرعون کے سیاہ خانۂ دل میں آرزوؤں کے ہزاروں سانپ پھن اٹھاتے لہراتے رہے۔ مگر موسیٰ کی روحانی قوت کے ایک ہی اژدر نے وہ سارے کے سارے نگل لئے۔ اور وہاں وہ مثل صادق آئی کہ "سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے"۔ اللہ کی شان جس خدا کی خدائی کا اُسے دعویٰ تھا۔ وہی خدا اس کو ایسا جبار و قہار ہوکر ملا۔ کہ اب تک قومیں اس کا حال سن سن کر اپنے پروردگار کے آگے سربسجود ہوتی ہیں۔

احوال قارون پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ عہد عتیق کی تاریخ سے یہ قصہ روشنی میں آیا۔ وہ فرعون کا معصر تھا اس کے پاس دولت تو بے اندازہ تھی۔ مگر باب اخلاق میں وہ مفلس قلاش تھا۔ اس نے اس قدر دولت جمع کر رکھی تھی۔ کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں کوئی نہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر اللہ رے شان کبریائی کہ ہوائے غرور اُسے دن رات اٹھائے پھری! اس وقت کے نبی نے اس کی آنکھوں پر سے غفلت کا پردہ اٹھانا چاہا۔ مگر وہاں تو خزانۂ دل پر ہی مہر لگ چکی تھی۔ اور اس کا دروازہ باہر سے ایسا چن دیا گیا تھا۔ کہ روشنی کی ایک کرن بھی اندر نہ جاسکتی تھی۔ یہاں تو قدرت

کا کھلا ہاتھ بھی بند ہو چکا تھا۔ موسیٰ کا بند ہاتھ کیا روشنی دکھاتا۔ موسیٰ نے ہزار جتن کئے کہ وہ راہ راست پر آ جائے۔ اُسے ڈرایا بھی اور دھمکایا بھی۔ مگر اس پر وعید کا کیا اثر ہونا تھا۔ وہ مجسم غرور دولت کے نشہ میں چور تھا۔ اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اگلے وقتوں کی مغرور اور دولتمند قوموں کا ورق ہستی الٹ دیا جاتا رہا اور کہ وہ دن دور نہیں جبکہ وہ بھی اس لڑی میں پرو دیا جائے گا۔ آخر اسی مال و دولت کی وجہ سے جسے دیکھ دیکھ کر وہ پھولے نہ سماتا تھا۔ اس کا غرور ٹوٹا اور دنیا کے عذاب سے چھوٹا۔ خدا کی قدرت جس دولت پر اسے ناز تھا وہ اُس کے کچھ کام نہ آئی۔ اور اُسے نقد جان عزرائیل کے حوالہ کرنا ہی پڑی۔ امیر؎

اہل دنیا حرص زر میں ہو گئے کیا کیا خراب
زہر قاتل ہو گیا شربت انہیں دینار کا

قوم مدین مدین بن ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔ اس کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک چلا گیا ہے۔ یہ قوم خلیج عقبہ کے دہانہ سے لیکر ساحل بحر احمر، حجاز اور ارض ثمود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پیغمبر حضرت شعیب تھے۔ اس کا ذریعہ معاش زیادہ تر تجارت تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ جو قافلہ تجارت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر مصر لے گیا تھا۔ وہ اسی قوم کا تھا۔ اس قوم کی تہذیب اس زمانے میں آپ اپنی نظیر تھی۔ جب

اِس قوم کی مالی اور اقتصادی حالت ترقی کرتے کرتے درجۂ کمال پر پہونچی۔ تو پھر اس میں بدمعاملگی۔ اور سوءِ عمل کے وہ تمام رستے جو دورِ انحطاط کا پیش خیمہ ہوتے ہیں کھل گئے۔ اور حلال و حرام کا امتیاز اٹھ گیا۔ آسمانی کتابوں میں اُن کی بدمعاملگی کی ایک خاص صنف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خرید و فروخت سے جو نفع تاجر اٹھاتا ہے۔ وہ وسائل ذیل سے اٹھاتا ہے۔ اوّل مال تھوڑی قیمت پر لے کر زیادہ پر بیچنا۔ دویم۔ مال زیادہ تول کر لینا۔ اور کم تول کر دینا۔ سویم۔ مال ایک جگہ سے لینا اور دوسری جگہ پہنچانا۔ پہلی اور تیسری وہ جائز صورتیں ہیں جس سے بیوپاری مقدور بھر نفع اٹھاتا ہے۔ دوسری صورت بالکل ناجائز ہے۔ اِس میں اور سرقہ میں صرف یہ فرق ہے۔ کہ چور چوری کرتے وقت اپنے آپ کو چور سمجھتا۔ اور چور کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ لیکن بدمعاملہ بائع جو کم تول کر دیتا ہے۔ تولتے وقت اپنے آپ کو نیک نیت بائع کی صورت میں جس کے کاروبار کی ساکھ بندھی ہو پیش کرتا ہے۔ یہ سارق گویا ایک غاصب ہے اور یہ بدمعاملہ بائع ایک خطرناک منافق جس قوم کو ماپ تول کم کرنے کا چسکا پڑا ہو۔ اُسے تمام برائیوں۔ بدیوں کی پوٹ سمجھیے۔ کیونکہ جس قوم کو بدخواہی اور بدسگالی کی لت پڑ جاتی ہے۔ اس کا اخلاق بالکل گیا گذرا ہوتا ہے۔ جس قوم کا اخلاق اِس درجہ گرا ہوا ہو۔ وہ زندگی کی دوڑ میں اوروں کے سامنے کیونکر ٹھہر سکتی ہے۔ اُسے آج بھی مٹا ہوا سمجھو اور کل بھی۔ ایسی قوم دنیا میں صلاح و آشتی کی کس طرح

روادار ہوسکتی ہے۔ وہ تو اپنی کج روی اور کج خلقی سے اپنے ہمسائیوں کا جہاں تک بس چلے قافیہ تنگ کرنے پر تلی رہے گی۔ جبھی تو اس قوم نے دنیا میں وہ فتنہ و فساد اٹھائے رکھا۔ اور اپنے ہمسایوں کا وہ ہیلو دبائے رکھا کہ کارکنان قضا و قدر کو اُن کو مٹا دینے کے سوا اور کوئی رستہ نظر نہ آیا۔ اس قوم کے خضر راہ حضرت شعیب اُسے بداخلاقی کی گہرائیوں سے نکال کر آب حیات کے کنارہ پر پہنچانا چاہتے۔ اور اس کے اخلاق میں اصلاح کی ایک روح پرور لہر دوڑانا چاہتے تھے۔ مگر یہ قوم تھی بڑی اکھڑ اور ضدی۔ وہ وادیئے ظلمات کے اندر سر ٹیں لپیٹتی ہوئی فنا کے اندھے کنوئیں پر جا پہنچی۔ وہ تو زر و سیم کے نشہ میں چور ہورہی تھی۔ اس کا خدا اس کا مذہب۔ اس کی جان۔ اس کی روح ورواں دولت اور صرف دولت تھی۔ پھر اس آستان آز و حرص سے وہ کس طرح منہ موڑ سکتی تھی۔ تاریخ کے اوراق کوئی دھو سکتا ہے۔ اور صدیوں کے اسٹے حقائق کوئی مٹا سکتا ہے۔ اُسے کیا خبر تھی کہ کم تول کر دینے اور زیادہ تول کر لینے میں اسکے گناہوں کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے۔ آخر ش اس کا انجام بھی وہی ہوا۔ جو دوسری سرکش قوموں کا ہوا۔ یعنی کہ یہ بھی موت کی ترازو تول کر دنیا سے اٹھ گئی۔ ع

تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

عاد۔ ثمود۔ مدین۔ قوم فرعون اور قارون کے اپنے ہاتھوں تباہی کی کہانی

لغت کی زبانی سن لی۔ دنیا اس قسم کی سینکڑوں قومیں کھا اور سلا چکی۔ آسمان
اس قسم کی ہزاروں قومیں اٹھا اور بٹھا چکا۔ زمانہ ایسے ہزاروں رنگ روپ بھر
چکا اور قومیں ایسے لاکھوں سوانگ بدل چکیں۔ اور خدا معلوم ابھی آنے والی
نسلیں کیا کیا گل کھلائیں گی۔ اور کیا کیا بکھیڑے اٹھائیں گی۔ لیکن ہر بار اسی
حقیقت کو دہرایا جاتا رہا ہے کہ مال و دولت کی بہتات آخر بس قومی تباہی کا موجب
ہو کر رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر قوم کی ہلاکت میں دولت کے ساتھ اس کے
عقاید و اخلاق کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ لیکن جب ہلاکت اقوام کے واقعات
کا تجربہ کیا جاتا ہے تو پھر یہ حقیقت واضح ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ مال و دولت
کی ریل پیل ہی قومی تباہی کی علت العلل ہے۔ ہم اس موضوع پر دو طرح سے
روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ایک مذہبی اور دوسرے تاریخی زاویہ نگاہ سے۔ مذہب
کا زاویہ نگاہ آسمانی کتب سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں ہم صرف
تاریخی نقطہ نظر سے بتانا چاہتے ہیں کہ دولت کی بہتات کس طرح قوموں کو لے
ڈوبتی ہے۔ پہلے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ کثرت سیم و زر کا تمدن سے کیا
تعلق ہے اور اس کا قوم کی اخلاقی اور معاشرتی اور تمدنی حیات پر کیا اثر
پڑتا ہے۔ پہلے ہم ان موٹے موٹے اصولوں کا جن کا کثرت مال و زر سے تعلق
ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے جائزہ لیں گے۔ اور پھر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان
اصولوں کا مختلف قوموں کی حیات پر کیا کیا اثر پڑتا ہے۔ اور ان سے ان کی

حالت کس طرح دگرگوں ہو جاتی ہے سُنیئے! اقوام کے عروج و زوال کا سبب ان کا ملکہ ضبطِ نفس ہے۔ کسی قوم میں یہ ملکہ جتنا زیادہ ہوگا۔ اتنی ہی وہ بلند ہوتی جائے گی۔ اور جتنا کم ہوگا۔ اتنی ہی گھٹتی جائے گی۔ جس طرح ایک فرد کے ملکہ ضبطِ نفس سے اس فرد کا اخلاق بنتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم کے ملکہ ضبطِ نفس سے اس قوم کے اخلاق کا ہیولیٰ طیار ہوتا ہے۔ پہلی قسم کا اخلاق شخصی اور دوسری قسم کا قومی کہلاتا ہے۔ جس طرح ایک شخص اپنے شخصی ضبطِ نفس کی بنا پر اپنے مختلف اعضا اور قویٰ پر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم اپنے قومی ضبطِ نفس سے اپنی حیات کے مختلف شعبوں صیغوں۔ اپنے سیاسی نظام اپنے عقائد اور اپنے علوم و فنون پر حکومت کرتی ہے۔ اور ان سب کو اسی رنگ میں رنگ دیتی ہے جس میں اُسے اس کے اپنے ضبطِ نفس نے رنگا ہو۔ جس قوم میں ضبطِ نفس کا ملکہ زیادہ ہوگا۔ اس میں ذیل کی باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

اوّل۔ عیش کوشی سے دوری۔

دوئم۔ دادگستری و انصاف پسندی۔

سوئم۔ ملکہ عسکریت کی تہہ گیری۔

چہارم۔ فنون لطیفہ کی کساد بازاری اور علوم و فنون مفیدہ کی سرپرستی۔

پنجم۔ نظام سیاست کی پختگی۔

قوموں کا ملکہ ضبطِ نفس۔ عیش کے سامان۔ حسن اور قوموں کی تباہی۔ صنفِ نازک سے وابستگی۔ راون کا قصہ۔ مغربیوں کی حُسن پرستی۔ مغلیہ خاندان کا زوال۔ ہند میں اسلامی سلطنت کے قیام کا ایک سبب راجے چند اور پرتھی راج کا باہمی عناد۔ سنجوگتا کا سوئمبر۔ ہندوستان کے خلجی خاندان کی تباہی۔ کشمیر کے مشہور شہر ست نگر کی تباہی۔ عمدہ عمدہ کھانوں سے لوگوں کی وابستگی۔ رومن قوم کا زوال۔ نفیس پوشاک پر قوم کی فریفتگی۔ فنِ تعمیر کی ترویج۔ شداد کا باغ ارم۔ قوم ثمود کا تعمیری ذوق رومن قوم کا تعمیری ولولہ۔ مغل شہنشاہانِ ہند کے تعمیری کارنامے۔ مصر اور ہند عتیق کا فنِ تعمیر۔ موسیقی اور دورِ انحطاط۔ محمد شاہ رنگیلا۔ رومن

شہنشاہوں کی گانے بجانے پر فریفتگی۔ شاعری اور قوم کا دورِ زوال۔
عربوں کی سحر آفرین شاعری۔

جو قوم اپنے نفس پر قابو پالے گی۔ اُسے عیش کیشی سے بالکل بیگانگی ہوگی۔ کیونکہ عیش کیشی دوسرے لفظوں میں نفسانیت کی باگ ڈور کا ڈھیلا کر دینا ہے۔ ایسی قوم میں اگر مال و دولت کی ریل پیل بھی ہو گئی۔ جب بھی اسکے اخلاق میں ذرا بھر فرق نہ آئے گا۔ اور اگر اس کے یہاں مال و دولت کی کمی بھی ہوگی۔ جب بھی اس کے نام کو بٹہ نہ لگے گا۔ بلکہ جس طرح یہ قوم امارت و ثروت میں کھیلتی ہوئی منازل ترقی لپیٹتی جائے گی۔ اُسی طرح افلاس کے پروں اُڑتی اور فضائے ترقی میں اونچی ہوتی جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ فراوانی مال سے قومی نفس کچھ وقت پاکر ضرور سرکش ہو جاتا ہے۔ مگر جب تک قوم کا ملکہ ضبطِ نفس اپنے محورِ اعتدال پر رہے گا۔ تب تک کثرتِ سیم و زر سے اس کے توازن میں ذرہ بھر فرق نہ آئے گا۔ تاریخ اقوام پر نظر ڈالنے سے عیاں ہوتا ہے کہ قوم کو عیش کیشی کی زبون عادت اس وقت پڑتی ہے۔ جبکہ اُسکے یہاں روپیہ پیسہ کی بہتات ہو۔ جو قوم افلاس کی حالت میں رہے گی۔ اُسے عشرت کی زندگی کہاں میسر آسکتی ہے۔ کیونکہ عیش کیشی کا سامان عیش کے مہیا ہونے پر منحصر ہے۔ اور سامانِ عیش مہیا ہی نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ روپیہ نہ ہو عیش کے سامانوں میں صنفِ نازک۔ لذیذ طعام۔ نفیس پوشاک۔ گانا بجانا۔

شاعری اور فنِ تعمیر کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ مردوں کی آغوش میں صنفِ نازک
کے افراد کی کثرت اُسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ قوم کا ملکۂ ضبطِ نفس کمزور پڑ گیا ہو۔
اور اُس کے اکثر افراد کو تلذذِ شہوانی سے دلبستگی پیدا ہو چلی ہو۔ عشرت پسند لوگوں
کا حال دنیا پر روشن ہے۔ کہ وہ اِس استلذاذ میں کس قدر ڈوبے رہے۔ اور اسکے
ہاتھوں اُن کا کیا انجام ہوا۔ سچ ہے نفس پرستی سے دو دو ہاتھ کرنا بڑے
جوانمردوں کا کام ہے۔ ؎

نفس وہ سرکش ہے کہ مارا نہیں جاتا
یہ جن کسی عامل سے اُتارا نہیں جاتا

انسان ضعیف البنیان کے لئے اگر کوئی مصیبت دنیا میں ہے تو وہ عشقِ مجازی ہے
اِس میں شک نہیں کہ عشقِ مجازی نردبانِ حقیقت ہے۔ وزیر ؎

پہنچا دیا ہے عشقِ بتاں نے خدا تلک
کیا نردبانِ بامِ حقیقت مجاز ہے

مگر یہ نردبان بھی اُنہیں کے لئے ہے جو دل رکھتے ہوں اور دل بھی ایسا
کہ اُس پر رخسارِ آتشیں اور موئے عنبریں کا خیال کیا بال برابر بھی بُرا اثر نہ ہو۔
ورنہ اگر دل ذرا ہلا تو پھر ایسا اُلجھا کہ اس کے لئے یہی نردبانِ حقیقت کمندِ
شقاوت بن جاتی ہے۔ غرض حسن سے امیر غریب بادشاہ فقیر کوئی بھی
نہیں بچ سکتا۔ مگر صرف مادی حسن تک ہی محدود ہوتا جب بھی کوئی بات تھی۔

مگر یہاں تو حضرتِ انسان کا دل بھی ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے کہ اس میں حسیات و جذبات کے ہزاروں طوفان چھپے آتے ہیں۔ دل کیا ہے ہزاروں آرزوؤں اور ارمانوں کا مقتل ہے۔ ایک حسرت مٹتی ہے تو دوسری آن موجود ہوتی ہے۔ ایک ارمان کا خون ہوتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ ایک آرزو کے ٹکڑے اڑتے ہوتے ہیں۔ تو دوسری جمعیت اکٹھی کر کے دعائے ابدال رہتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک خانۂ خدا میں ایسے ہزاروں جھوٹے خداؤں کا ٹھکانا کیسا! امیر ؎

ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں
دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویراں ہوتا

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہوا۔ اب دوسرا بھی دیکھ لیجئے۔ حسینوں کے ناز و انداز کون اٹھائے۔ ایک ہو تو کچھ ہو بھی۔ مگر یہاں تو ہزاروں انداز ہیں۔ اور پھر ایک ایک کے اندر ہزاروں ناز۔ بھویں ہیں تو خنجر کا کام کئے دیتی ہیں۔ نگاہیں ہیں تو سینے کے آر پار ہوئی جاتی ہیں۔ زلفیں ہیں تو الگ اندھیر مچائے رکھتی ہیں۔ داغ ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

ان کی زلفوں کا سلجھنا کون دیکھ سکے۔ اور ان کالے سانپوں سے بھلا کون الجھے ؎

ان کا سلجھانا بھی تو دور، کیا الجھاؤ ہے۔ امیر ؎

سُلجھاتے ہیں جب زلف تو اُلجھاتے ہیں کے دل
فرق اس میں کبھی بال برابر نہیں ہوتا

حسینوں کی کونسی بات یاد کی جائے۔ اور کونسی بھلائی جائے۔ اُن کی بات بات میں قوموں کی تباہی کے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔ ان کے خال خال سے ہندو مسلمان سپند آسا دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ اُن کے بال بال میں ساری دنیا کا تاجیات بندھا ہے۔ اور تو اور چاہ غبغب اور چاہ ذقن کو ہی لو۔ ان میں ہزاروں گھرانے ڈوب مرے۔ یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں۔ بلکہ یہ قدرت کا بندھا ہوا قانون ہے۔ جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ لوگ خیال کرتے ہونگے۔ کہ جسے ڈبونا ہوتا ہے اُسے قدرت کیا کیا کنوئیں جھکاتی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ساری دنیا کے ڈبو دینے کو یہی دو کنوئیں بس کرتے ہیں۔ پھر ان روشن کنوں پر زلف کی الجھن ان اندھے کنوؤں کو اور بھی تیرہ و تاریک کئے دیتی۔ اور سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ جو محبت کے چاہ سے بچتے ہیں۔ وہ ضرور کسی دوسرے دال پر پھنسنے اور تا محبت میں کچھ ایسا اٹکتے ہیں۔ کہ عمر بھر نہیں چھٹتے۔ امیر

حسینوں میں عاشقوں کے کہاں عاشقوں کے دل
کچھ زلف میں ہیں کچھ ترے چاہ ذقن میں ہیں

یہ کوئی شاعروں کی رنگین بیانی اور جدت طرازی نہیں۔ بلکہ یہ تو حقیقت طرازی ہے۔ سچے عاشقوں کی بات تو رہنے دیجئے۔ جو لوگ بندہ عیش اور غلام نفس ہیں

اِن پر آنکھ کا وہ جادو چلتا ہے کہ الاماں۔ دُنیا کی تاریخ ایسی ہزاروں داستانیں پیش کر سکتی ہے جن سے یہ بات آئینہ ہوتی ہے کہ جس جس قوم اور جس جس خاندان پر تباہی آئی۔ اس میں زیادہ ہاتھ چشم نرگسی اور حسن مادی ہی کا تھا۔ اس میں کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ساری مجلسوں کی زینت ساری محفلوں کی رونق حسن کی شمع سے ہی ہے۔ جہاں کوئی لالہ رو نہ ہو۔ وہاں کسی سینے میں محبت کا داغ نہیں جہاں کوئی شعلہ رو نہ ہو۔ وہاں کسی دل میں عشق کی آگ نہیں۔ جہاں کوئی گلعذار نہ ہو۔ وہاں محبت کے پھولوں میں رنگ و بو نہیں۔ جہاں کوئی گیسوؤں والا ماہرو نہ ہو۔ وہاں چاند نہیں۔ اور چاند کے لئے اندھیری رات نہیں۔ جہاں کوئی دلربا ساقی نہ ہو۔ وہاں شیشہ نہیں۔ جام نہیں۔ مے نہیں۔ امیر ؎

صحن چمن ہو ابر ہو شیشہ ہو جام ہو
یہ سب تو ہوں غضب ہے کہ پہلو میں تو نہ ہو

گویا حسن ہی ساری دُنیا میں ڈاکو ہے۔ قزاق ہے۔ جو قافلہ یہاں پہنچتا ہے۔ وہ ضرور لٹتا ہے۔ ؎

امیر اس راستے سے جو گزرتے ہیں وہ لٹتے ہیں
محلہ ہے حسینوں کا کہ قزاقوں کی بستی ہے

راون کا مشہور عالم قصہ اسی مادی حسن کی ایک پارینہ داستان ہے۔ وہ تھا تو بڑا عالم اور وِدوان لیکن اس کے بگڑے ہوئے ذوق کے ہاتھوں جو اُس کی گت

ہوئی وہ منائی جاتی ہے۔ اُسے دُنیا بھر کے مقامات سے ہزاروں سال ہونے کو آئے۔ مگر داوست نفس بے ہنگام ان کے نواسوں کی ہر سال سالگرہ منائی جاتی ہے۔ اس کے اس شرِ نفسانی نے تمام جہان میں آگ لگا رکھی ہے۔ وہ خود بھی ہر سال جلتا اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ ؎

بے ادب خود را نہ تنہا داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

آجکل فرانس اور دیگر مغربی ممالک میں صنفِ نازک کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ناچ گھروں میں ان کا ناچ دکھایا جاتا اور اُن کی عریانی سے حظ اٹھایا جاتا ہے۔ ان کے ناز و انداز پر جانیں نثار کی جاتی ہیں۔ انکی مسکراہٹ کے نیچے ہوتے ہیں۔ انکی قیمتیں دی جاتی ہیں۔ ان سے ہوٹلوں کی رونق بڑھائی جاتی ہے۔ ان رنگوں کی چمک دمک اگر اسی رفتار سے بڑھتی گئی تو ضرور ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی۔ اور انہیں شام و سحر ٹھکانے لگا کر اور اُن جیسی اگلی قوموں سے ملا کر رہے گی۔ الٰہی توبہ۔

یاں اور رستے کو ہو ٹھہرے ہوئے چاہیں
اپنا بھی کوچ شام ہوا یا سحر ہوا

مشرق کے کم سواد لوگ اگر باتوں میں مغرب کی پیروی کرنے لگے تو وہ بھی اپنا چلن بگاڑ بیٹھیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاں ایک انسان کے ایک

بُرے فعل سے اتنے بندگانِ خدا کے خرمنِ جمعیت پر برقِ انتشار گرتی ہے۔
وہاں ایک قوم کے کارنامہ ہائے تعیش سے کس قدر دل ڈگمگاتے ہوں گے۔
آج بھی عشرت پسند قوموں کا وہی انجام ہو کر رہتا ہے جو اس سے پہلے ہوا ہے۔

جا چکا [illegible] عدم ہو [illegible]

ہم بھی دم بھر میں خدا چاہے تو بن بیٹھیں

مغلیہ خاندان کا عروج و زوال دنیا کے سامنے ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت تک یہ خاندان پھلتا پھولتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی ضعف کے وہ تمام اسباب جو دورِ انحطاط میں قوم کو روک لیتے ہیں۔ کم و بیش پیدا ہو چلے تھے کچھ مورخوں کی رائے ہے کہ مغلیہ خاندان کے زوال کا بڑا باعث اورنگ زیب کا مذہبی ولولہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامیوں کا مذہبی ولولہ ہی ہر جگہ اُن کے عروج کا باعث ہوا۔ قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی کامیابی کا راز اُن کا مذہبی جوش و خروش تھا۔ تاریخ کے مطالعہ سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مسلمان دنیا کے جس حصے میں گئے وہاں وہ اپنا ضابطہ۔ اپنی تہذیب۔ اپنے احکام اور اپنا نظامِ حکومت ساتھ لیتے گئے انہوں نے جزیہ بھی لگایا۔ اور خراج بھی وصول کیا۔ اور دوسری قوموں کو زیر و زبر کرنے کے جس قدر جائز طریقے ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی اختیار کئے۔ لیکن جب بھی وہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔ اِس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ عیش و عشرت

سے کوسوں دور۔ بابر اخلاق میں نورٌ علیٰ نور۔ سادہ زیست پر بکے ہوئے اور فوجی
ذہنیت پر مر مٹے ہوئے تھے لیکن جونہی ان کے بعد والوں کا زاویہ نگاہ بدلا۔ اور
عیش پرستی نے اُن کے دل میں راہ لی۔ تو پھر اُن کی سلطنت کا ہر شعبہ رو بہ انحطاط ہوا
اور قوم کے قدم اکھڑنے شروع ہوئے۔ بعینہٖ یہی صورت مغلیہ خاندان کی ہوئی۔ مغل
شہنشاہوں کی حکومت مطلق العنان تھی۔ اسلئے حکومت کا اقتدار شہنشاہ کی ذاتی
سیرت سے وابستہ ہوتا تھا۔ جب تک مغل شہنشاہ زبردست سیرت کے رہے
اُن کی سلطنت بھی پھلتی پھولتی رہی۔ اور جب اُن کے یہاں عیش کوشی کا دور دورہ
ہوا۔ اور تلواریں ہاتھ سے چھٹنے لگیں۔ تو پھر سلطنت کی زرہ بھی ڈھیلی ہونی شروع
ہوئی۔ تاریخ کہ رہی ہے کہ اورنگ زیب گو کہ خود زیب دہ تخت و تاج تھا لیکن
اس کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے وہ بہت گری ہوئی سیرت کے تھے اور اُنکا
ملکہ ضبط نفس اس قدر کمزور تھا۔ کہ وہ تمام عمر نفسانی خواہشات میں ہی اُلجھے
رہے۔ اس لئے ان کے عہد میں فنون لطیفہ خوب چمکے۔ اور عیش و عشرت کے سامان
بہت پھیلے۔ اور یہی باتیں اُن کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اورنگ زیب
کے بعد اُس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ اس قدر کمزور طبیعت کا تھا۔ کہ
وہ اپنے وزیر کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا جہاندار شاہ
تخت پر بیٹھا۔ یہ بھی بہت گرے ہوئے اخلاق کا تھا۔ مورخ اسے عیش و عشرت
میں ڈوبا ہوا۔ اخلاقاً بہت گرا ہوا۔ حیا و شرم سے بیگانہ۔ اپنے وقت کا شہزادہ یگانہ

بیان کرتے ہیں جہاندار شاہ نے فرخ سیر کے ہاتھوں موت کا جام پیا۔ اور فرخ سیر خود بھی دنوں میں لقمۂ نہنگ اجل ہوا! ان کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے وہ سب کے سب فسق و فجور کی لغلیں جھانکتے اور عیش و آرام کا پہلو ٹٹولتے رہے۔ اور دنیا کا کوئی گناہ ایسا نہ تھا جس سے اُن کا دامن داغدار نہ ہوا۔ اُن کی اس عیش کیشی کی وجہ سے ہی سارے ہندوستان کو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی آماجگاہ بن کر وہ وہ مصیبتیں اٹھانا اور وہ وہ دُکھ سہنا پڑے کہ دل امان امان کرتا ہے۔ ایک مستند تاریخ ہند میں ہے کہ "سلطنت مغلیہ کے زوال کا بڑا باعث یہ تھا کہ یہ حکومت شخصی تھی۔ جس کی زندگی کا دار و مدار حکمران بادشاہ کے جسمانی اور نفسانی اوصاف پر تھا: اورنگ زیب کے بعد کوئی بڑا مغل نہیں اُٹھا۔ اور نام کے بادشاہ مخالف پارٹیوں کے ہاتھوں میں مٹی کی آپا بنے رہے۔ یہ شہنشاہ ضعیف متلون المزاج بدروش اور حرم کی چاردیواری کے اندر تعلیم و تربیت پائے ہوئے تھے۔ اور وہ ان اوصاف سے بیگانہ ہوتے تھے جن کے بل پر اُن کے جانشین ما تقدم اس تعلیم کے بُرے اثرات سے بچ نکلتے تھے۔ عیش و عشرت اور ضعیف کن آب و ہوا نے فوج کے جنگجو یانہ اوصاف کا بھی ستیاناس کر دیا تھا" [۱۵] اس میں شک نہیں کہ یہ مؤرخ بھی لکھتے ہیں کہ رواداری اور

---

[۱۵] تاریخ ہند انگریزی از پروتھرڈ ایم۔ اے۔ و چندرا ودیا بھوسانا ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ص ۳۸۹ تا ۳۹۱

۔ ہیچ ومدانِ حکمت عملی بھی مغلوں کی اس اجنبی حکومت کے قیام کے لئے ضروری تھی لیکن اصل وجہ قیام سلطنت کی شہنشاہ اور اُن کے ارکین دربار کی خوبی سیرت روکھی سوکھی دینداری، قومی چلن اور سادہ ماندوبود تھی۔ یہ باتیں اورنگ زیب کے وقت سے ہی رخصت ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اور اس کے بعد بالکل عنقا ہو گئیں اورنگ زیب کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے۔ ان کا مطمح نظر لذذ جیوانی اور صہبانوردی تھا، اور یہی مطمح ان کی سلطنت کی تباہی کا باعث ہوا۔ ان بادشاہوں کے عہد میں اب کوئی بات کم نہ تھی۔ حسن کی دیویاں حوروں سے آنکھ لڑاتی تھیں ساغر مے جام جم سے ٹکر لیتے اور حسینوں کو دیکھ دیکھ کر چکر میں آتے تھے۔ ان کے محل فلک ہا سقفوں سے سرگوشیاں کرتے اور انکی اخلاقی پستی کا پتہ دیتے تھے۔ انکے راگیوں کی تانیں آسمان کی خبریں لاتی تھیں۔ انکی ضیافتیں شاہان روم کی عزومیلی کو بے مرہ کئے دیتی تھیں۔ اُن کا زرق برق لباس انکے جسم سے تقوی کا جولا اتارے جا رہا تھا۔ ان کی بزم آرائیاں اندر کے اکھاڑے کو ماند کرتی تھیں۔ انکی رزم آرائیاں شکستِ فاش کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ ان کے باہمی اختلاف قوم کا شیرازہ بکھیر رہے تھے۔ ان کے سپوت اب سب کپوت تھے۔ ان کے جوانمرد سب جوانمرگ اور ان کے خوردسال سب ناز و نعمت کا مال تھے۔ اب جبکہ شکار صیاد اجل کی زد پر آ گیا تھا۔ پھر کسر کس بات کی تھی۔ امیرؔ

تیر چلنے ہی کماں ہاتھ میں نخچیر قریب ۔۔۔ انتظار اب تجھے اے تیر فگن کس کا ہے

تاہم حیوانی یعنی جذبہ عقلی افراد کو کیا قوموں کو تہ و بالا کیے دیتا ہے۔ اسلامیوں کی اجنبی حکومت نے جو ہندوستان میں ڈیرے ڈالے۔ وہ اصل میں اسی تلذذ کا ایک چھپا کرشمہ تھا۔ تاریخ ہند کے پڑھنے والے حیران ہوں گے۔ کہ یہ کس طرح ہوا اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ ناظرین کو غور کرنا چاہیئے کہ محمد غوری نے جب ۱۱۸۴ء میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ تو وہ آگے بڑھتا چلا آیا۔ راجپوتوں نے جب دیکھا کہ وہ برابر بڑھا چلا آتا ہے۔ تو سب نے اتفاق کر کے ۱۱۹۱ء میں کرنال اور تھانیسر کے درمیان تراوڑی کے مقام پر اُسے روک لیا۔ اور ایسے جان توڑ کر لڑے کہ محمد غوری نے غزنی میں ہی پہنچکر دم لیا۔ اس کے بعد راجہ جے چند والی قنوج نے اپنی بیٹی سنجوگتا کا سوئمبر رچایا۔ اور سب راجاؤں کو بلایا۔ لیکن دلی کے راجہ پرتھی راج کو دعوت نہ دی۔ بلکہ اس کی توہین کرنے کو اسکی ایک طلائی مورت بناکر محل کے پھاٹک پر بطور خدمتگار کے نصب کر دی۔ پرتھی راج کا دل سنجوگتا کے زلف گرہ گیر میں الجھا ہوا تھا۔ اسے جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو وہ غصہ سے لال بھبوکا ہوا۔ لیکن پھر گوہر مقصود ہاتھ سے جاتا دیکھ کر مدھم ہو کے رہ گیا۔ وہ تو سنجوگتا کو دل دیئے بیٹھا تھا۔ اس کے لئے مرنا اور جینا برابر تھا۔ اُسے وقت پر سوجھی۔ اور خوب سوجھی۔ تھوڑی سی فوج لے کر قنوج کو چل پڑا۔ جب شوہر کے انتخاب کا وقت آیا تو سنجوگتا ہاتھ میں مالا لیے سب راجاؤں کے آگے سے گذر گئی اور دروازے پر جاکر پرتھی راج کی مورت کے گلے میں

مالا ڈال دی۔ پرتھی راج بھی تاک میں بیٹھا تھا۔ وہ معاً دروازے پر آیا اور سنجوگتا کو اپنے گھوڑے پر سوار کر کے دلّی لے اڑا۔ سب راجاؤں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور عندلیب خوش نوا دام محبت میں گرفتار ہو کر دلّی کے شاہی باغوں میں جا چہکی۔ اس دن سے ان دونوں راجپوت ریاستوں کی آپس میں لاگ ٹھنی۔ محمد غوری بھی کوسوں دور بیٹھا موقعہ تاڑ رہا تھا۔ اس سے بہتر موقعہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ اس نے جھٹ ایک لشکر جرار طیار کیا۔ اور دلی پر چڑھ آیا۔ پرتھی راج نے مقابلہ تو کیا۔ مگر گھر کی پھوٹ کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔ راجہ جے چند اور اُس کے طرفداروں نے اس کا بالکل ساتھ نہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتھی راج پر شکست پڑی اور وہ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اس کی رانی سنجوگتا بھی جل کر ستی ہوئی۔ اور اس طرح اُن کی الفت کا بُرا انجام ہوا۔ جے چند بھی غوری حملہ کی زد سے نہ بچا۔ یعنی ۱۱۹۴ء میں محمد غوری نے اس پر بھی چڑھائی کی۔ اور اس کی سلطنت کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو دلی کا ہوا تھا۔ اسوقت سے ہندوستان میں اسلامیوں کی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ جو صدیوں تک قدم جمائے رہی۔[1]

تاریخ ہند کا ایک ایک ورق پڑھنے والوں کے لئے عبرت کا ایک بے پایاں

---

[1] دیکھو تاریخ ہند مولفہ سیتا رام کوہلی ایم۔ اے و ایشور پرشاد ایم۔ اے۔ ص ۱۵۹ تا ۱۶۰

دفتر ہے۔ اس تلذذ جبوانی نے ہزاروں بستیاں ڈبو دیں۔ لاکھوں گھر برباد کیئے۔ اور خاک پاک ہند کا کوئی شاہی خاندان ایسا نہیں۔ جو اس کے زخم پنہاں کا گھائل نہ ہوا ہو۔ اللہ اللہ! اتنا سا انسان اور کس بلد کی اٹھان! جس پر ایک دفعہ سایہ پڑا۔ وہ پھر سایہ ہی ہو کے رہ گیا۔ حسن میں بھی بلا کی کشش ہے۔ بادۂ الفت میں بھی غضب کا کیف ہے۔ ع

تیرے مستوں کی بہک جاتی نہیں

ہم نے تاریخ ہند بغور پڑھی۔ اور کئی بار پڑھی۔ ہر بار ہمارے ذہن میں یہی بات آئی کہ ہندوستان کے قریباً سب شاہی خاندانوں کی تباہی کی تہ میں عشوہ گری معشوقوں کی کام کرتی رہی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آخر کو پانی مرتا رہا۔ اور پھر گھروں کے گھر ڈوب جاتے رہے۔ دنیا میں بڑے بڑے شہسوار ہوئے۔ مگر جب گرنے کو آئے تو اسی گڑھے میں گرے۔ اور پھر ایسے گرے کہ اب تک ان کا پتہ نہیں۔ اپنے اپنے وقت پر ایسے ایسے یکہ تاز اٹھے کہ انہوں نے اپنے سمند اقبال کی باد رفتاری سے تند ہوا کو بھی بٹھا دیا۔ مگر جب وہ بھی ٹھوکر کھانے کو آئے۔ تو اسی جگہ ہی ٹھوکر کھائی۔ ؎

وہ اوگھٹ راہ ہے اے مصحفی دشت محبت کی
کہ سم لیتا ہے مرکب جس زمیں پر یکہ تازوں کا

ہندوستان میں خلجی خاندان اپنے وقت میں مشہور ہو گذرا ہے۔ اسکی حکومت

سنہ ۱۲۹۰ء سے سنہ ۱۳۲۰ء تک یعنی کل تیس۳۰ سال رہی۔ علاؤالدین خلجی نے سنہ ۱۲۹۵ء سے سنہ ۱۳۱۶ء تک حکومت کی۔ اس نے جب اپنے چچا جلال الدین خلجی کے پیٹ میں خنجر بھونک کر اس کا کام تمام کرلیا۔ تو پھر عنانِ توجہ ملک گیری کی طرف پھیری۔ اس نے رنتھمبھور فتح کرکے چتوڑ پر چڑھائی کی۔ اس چڑھائی کی اصلی وجہ یہ ہوئی۔ کہ اس کے کانوں میں یہ بھنک پڑگئی تھی کہ چتوڑ کے رانا بھیم سنگھ کی رانی پدمنی حسن و خوبی میں واقعی پدمنی ہے۔ اورکہ آج اس کے برابر کی دوسری کوئی عورت نہیں۔ اس لئے اس کے دل میں پدمنی کے حاصل کرنے کی آرزو لہرائی۔ اُس نے چتوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اور بڑے زور و شور سے کیا۔ مگر انجام کچھ نہ ہوا جب اُس کی آس ٹوٹ گئی۔ تو اس نے راناکو پیغام بھیجا کہ اگر مجھے پدمنی کی شکل ہی دکھادی جائے تو میں محاصرہ اٹھاکر واپس چلا جاؤں گا۔ راجہ نے پہلے تو سانپ کیطرح پیچ و تاب کھائے۔ مگر جب اُس نے سوچا کہ اتنی سی بات سے ہزاروں بندگانِ خدا کی جانیں بچ جاتی ہیں۔ تو اُس نے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ پدمنی کا عکس پردہ کے پیچھے سے آئینہ میں دکھلایا جاسکتا ہے۔ علاؤالدین نے اسی پر رضامندی ظاہر کی۔ اور چتوڑ کے قلعے میں جاکر رانی کا عکس آئینہ میں دیکھا عکس کا دیکھنا تھا کہ آنکھوں کی راہ سے دل میں اُتر گیا۔ امیرؔ

آنکھ اُس آنکھ سے دیکھو نہ مقابل ہو امیر
اسی کھڑکی سے اُتر آتا ہے جادو دل میں

بادشاہ بادل ناشاد واپس ہوا اور راجہ اسکے رخصت کرنے کو قلعہ کے دروازہ
تک آیا۔ دروازے پر علاؤالدین کے مسلح سپاہی گھات لگاتے بیٹھے تھے۔ انھوں نے
جھٹ راجہ کو مضمون کی طرح باندھا اور مشکیں کس کر شاہی کیمپ میں پہنچا دیا۔ اب
تو علاؤالدین کے پو بارہ تھے۔ اس نے رانی کو کہلا بھیجا کہ جب تک تو مجھے نہ
ملے گی۔ راجہ رہا نہ ہوگا۔ راجہ تو پہلے ہی سے گرفتار تھا۔ اب رانی بھی قید غم میں
گرفتار ہوئی۔ سخت تلملائی۔ سخت پھڑپھڑائی۔ مگر چھٹنا کیسا اور کہاں کا!۔
آخر اُسے دُور کی سُوجھی اور خوب سوجھی۔ اُس نے علاؤالدین کو کہلا بھیجا۔ کہ میں
آنے کے لئے طیار ہوں۔ مگر اکیلی نہ آؤں گی۔ بلکہ میرے ساتھ میری تمام لونڈیاں
ہونگی۔ علاؤالدین کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ وہ تو چاہتا ہی تھا۔ کہ مرغ وحشی کسی طرح
دام میں آئے۔ رانی خود ڈولی میں سوار ہوئی۔ اور اس نے سات سو سورما سپاہیوں
کو بھی کیل کانٹے سے لیس کر کے اور زنانہ لباس پہنا کر ڈولیوں میں سوار کیا۔ اور
ساتھ لیا۔ جب ڈولیاں سامنے آئیں۔ تو علاؤالدین کی باچھیں کھل گئیں۔ جب
ڈولیاں اتاری گئیں۔ تو مسلح سپاہی تلواریں سونت کر نکل پڑے۔ اور راجہ اور
رانی دونوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے چلتے ہوئے۔ علاؤالدین ہاتھ ملتا رہ گیا۔ کہ
آیا ہوا شکار ہاتھ سے گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اپنا سا منہ لے کر دارالخلافہ کو
واپس ہوا۔ جب دوسری بار علاؤالدین نے چتوڑ پر فوج کشی کی۔ اور قلعہ فتح ہوا
تو رانی نے ملکی رسم ورواج کے مطابق آگ میں کود کر جان دیدی۔ اور اس طرح

علاؤالدین کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ اس کے بعد علاؤالدین نے راجہ کرن کی رانی کملا دیوی اندر ڈال لی۔ اور اسکی لڑکی دیول دیوی کو بھی منگا کر اپنے ولیعہد خضر خاں سے اس کی شادی کر دی۔ بادشاہ کا وزیر اعظم کافور تھا۔ اُس نے بڑے فتوحات کئے تھے۔ جب علاؤالدین خلجی نے داعی اجل کو لبیک کہی۔ اور ملک اس کے نفسانی خلجان سے چھوٹا تو کافور نے اس کے چھوٹے بیٹے کو بادشاہ بنا کر انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بھی تہ تیغ ہو کر کافور ہوا۔ اس کے بعد قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ عیش و عشرت کا بندہ زنانہ کپڑے پہن کر بازاروں اور گلیوں میں گانا بجانا اور اپنی نامسعود حرکتوں کا مظاہرہ کئے پھرتا۔ خدا کی قدرت! تھوڑے ہی دنوں میں دنیا اُس کے نامبارک وجود سے بھی پاک ہو گئی۔ اور پھر دنوں ہی میں سارے خلجی خاندان کی خلش بھی ہمیشہ کے لئے مٹ گئی[۱]۔ خلجی کیا۔ غوری۔ غلامان۔ تغلق۔ لودھی۔ سوری۔ کتنے ہی آئے۔ اور کتنے ہی لے دنیا۔ تو نے چُن چُن کے لئے۔ امیر ؎

تیری بانکی چتون نے چُن چُن کے مارے
نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے

---

[۱] یہ تمام حالات سکولوں کی تاریخوں میں موجود ہیں۔ دیکھئے تاریخ ہند مولفہ سیتارام واشیور پرشاد۔

اے دُنیا! انکے باغوں کی کلی کلی اور پتی پتی۔ تیری بے وفائی اور ستم شعاری کی داستان کہ رہی ہے۔ اوران کا پھول پھول تیری تند ہوا کا شکوہ کیے جاتا ہے وہ تند ہوا جس نے چلتے چلتے نونہالانِ چمن کے کان مروڑے۔ جس نے تھپیڑوں سے پھولوں کے منہ لال کیئے۔ جس نے لب بستہ گلوں کے دامن چاک کیئے اور اُن کی پتی پتی اور پنکھڑی پنکھڑی صحنِ چمن میں بکھیر دی۔ اے مکار دنیا! اے دغاباز دنیا! تیری خزاں اِن باغوں کو لوٹ ہی لے گئی۔ اور باغبان تڑپتے سر پھوڑتے رہ گئے۔

خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

اگلے زمانے میں کشمیر میں ایک مشہور شہر ست نگر تھا۔ یہ اُسی جگہ آباد تھا جہاں آجکل جھیل وُلر لہریں لے رہی ہے۔ یہ شہر دو اڑھائی ہزار سال ہوئے بڑا آباد تھا۔ اور اسکی آبادی لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ ایک زمانہ اس شہر پر ایسا آیا کہ اس سے بُرا زمانہ اس پر کبھی نہ آیا تھا۔ اس وقت لوگ عیش کوشی میں اس قدر محو ہوئے کہ فسق و فجور اور سیکاری وقت کا فیشن ہو گئے۔ ایک خدا کا بندہ اُن میں سے اٹھا۔ جس نے ان کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر ان پر ڈرانے دھمکانے کا کیا اثر ہونا تھا۔ وہ الٹا اس کا تمسخر اڑانے لگے۔ آخر وہ وقت آن پہنچا۔ جبکہ خدا کا قہر فاسق و فاجر قوم کو آلیتا ہے۔ ایک دن کیا ہوا۔ کہ ایک نانبائی کے تنور سے

پانی اُچھلا اور ایسا اچھلا کہ تمام شہر ڈوب گیا اور ایسا چڑھا کہ پھر نہ اُترا۔ یہ پانی کا
اچھال نہ تھا۔ اُن کے فسق و فجور کا اُبال تھا۔ یہ پانی کا اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔ بلکہ انکے
جذبات اُنکی خواہشات کا مدوجزر تھا۔ اس وقت بھی کوئی وہاں جاکر دیکھے تو کسی
کسی جگہ پانی کی گہرائیوں میں ٹوٹی پھوٹی دیواریں نظر آتی ہیں۔ جو دیکھنے والوں
کے دلوں میں بے ثباتی دنیا کا نقش کھینچ کر غرور کی دیوار گرا دیتی اور پندار
کا نام نشان مٹائے دیتی ہیں۔ ؏

خدا کی شان ہے ایسوں کی حالت ایسی ہوتی ہے

یہ پری پیکر شہر سچ مچ معنوں میں بہشت بریں کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہ شہر بہشت
کے اندر بجائے خود ایک چھوٹا سا بہشت تھا۔ یہاں جا بجا چشمے پھوٹتے اور چپہ
چپہ پر فوارے چھوٹتے تھے۔ قسم قسم کے ہلکے پھلکے چمکیلے پھول قدم قدم پر سر نکالے
اہل دیار کی سبکسری کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ کلیاں چاروں طرف منہ کھولے
اس دیار کے رہنے والوں کی نسبت کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ نرگس ان کی خیرہ چشمی
پر حیران ہوئی جاتی تھی۔ سوسن رنگ چمن بگڑا دیکھ کے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ سنبل
ان کی معاشرتی الجھنیں دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ سرو انہیں محل
آزادگی میں پاگل دیکھ کر زمین میں گڑا جاتا تھا۔ ہزار داستان کی داستانِ گل
اب طاقِ نسیاں میں دھری تھی اور بلبلوں کی غزل خوانیاں موقوف ہو چکی
تھیں۔ اب ہوا اس اجڑے دیار کو دیکھ دیکھ کر اس کی بربادی کا نوحہ پڑھ رہی تھی

تھیں. جہاں ایک وقت اس قدر سامان عیش و نشاط موجود تھے۔ اب وہاں کوئی بلبل تھا نہ گل و مل۔ صحن چمن تھا نہ شہ گل کا تجمل۔ افسوس۔ رُباعی

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کا شور تھا فریادتھی غل تھا
خزاں کے دن گئے تو کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

جس طرح صنفِ نازک سے حظ اٹھانے میں اسراف ہوتا ہے اسی طرح کھانے پینے میں بھی اسراف ہوتا ہے۔ انسان کے لئے بہترین غذا سادہ ہے۔ اور غذا کی سادگی اقتصادی نقطہ نگاہ سے کیا اور طبّی زاویہ نظر سے کیا نہایت ضروری ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ سادہ غذا ہی اُلٹ لگتی اور بدن کی خوب پرورش کرتی ہے اور عمدہ بنیاد پر ہی عمارت بھی اچھی اٹھائی جا سکتی ہے۔ زر و سیم کے زیادہ ہونے جس طرح انسان عورتوں کی طرف زیادہ جھکے گا۔ اسی طرح عمدہ عمدہ کھانے پینے پر بھی زیادہ گرے گا۔ ازمنہ اولیٰ کی تاریخ بتاتی ہے کہ رومن قوم جب اپنی فاتحانہ سرگرمیوں سے مالامال ہوئی اور اس کا تمدن درجہ کمال پر پہنچا۔ تو جہاں اس میں اور خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وہاں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوگئی۔ کہ وہ اچھے اچھے کھانوں پر بک گئی۔ یہ پڑھ کر ایک اطالوی کا دل کڑھتا ہوگا کہ ان کے یہاں جب کسی تقریب پر دعوت ہوتی۔ تو جہاں انکے دسترخوان پر

کئی طرح کے کھانے چنے جاتے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے پرندوں کی زبانیں بھی بھونکر رکھی جاتیں۔ اور اس طرح ایک لمحی ذائقہ کے لئے چھوٹے چھوٹے پرندوں کو ہلاک کردیا جاتا۔ مگر اس سوختہ اختر قوم کو کیا معلوم تھا کہ ان چھوٹے چھوٹے جانوروں کی ہلاکت میں انکی اپنی ہلاکت مضمر ہے۔ شہنشاہ آگسٹس کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے اُن کی عمدہ عمدہ کھانوں پر دلدادگی ضرب المثل ہو چکی تھی۔ اور وہ عیش کوشی کو شہنشاہیت کا لازمہ خیال کرنے لگے تھے۔ آگسٹس کے بعد ٹبریس[1] اور ٹبریس کے بعد کیئس[2] بادشاہ ہوا۔ مؤخر الذکر کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ عیش و عشرت کے جس قدر سامان ہوسکتے ہیں۔ وہ اس کے عہد میں رواج پا چکے تھے۔ شاہی دعوتوں اور کھانوں کا یہ حال تھا۔ کہ بلبلوں۔ طوطوں اور دیگر جانوروں کی زبانیں اور مغز بھون کر دسترخوان پر چنے جاتے۔ اور قیمتی موتی تیزاب میں گلا کر رکھے جاتے اور ایک[3] ایک معمولی کھانے اور تفریح کے موقعہ پر اسی اسی ہزار پونڈ اڑا دیئے جاتے اس پر بھی بادشاہ کہدیتا کہ "انسان کو کفایت شعار ہونا چاہیئے[3] بشرطیکہ وہ سیزر نہ ہو"۔ کیس کے بعد ایک وقت نیرو بادشاہ ہوا اور ایک وقت وٹی لیس[4]۔ ان دونوں نے کیس کو بھی مات کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وٹی لیس دورے پر نکلتا تو وہ اپنی

---

[1] Tiberious [2] Caius [3] تاریخ رومن امپائر از گروپ جلد ۵۔ ص ۲۸۵ [4] Vitellius

دعوتوں اور تفریحوں کے لئے امیروں کے جیب کترتا۔ اپنے دشمنوں کی جائدادیں لوٹتا اور خدا جانے کن کن کلیجوں میں ہاتھ گھنگھولے پھرتا تھا۔ یہ شہنشاہ اب انسان نہ تھے۔ بلکہ خدا بنے بیٹھے تھے۔ کہ خوب رنگ رنگ کے پانے باندھتے۔ سارے ملک کے کئے پر پانی پھیرتے۔ اور ساری قوم کی گاڑھی کمائی ٹھکانے لگائے جاتے تھے ان کے حرم کے حالات لکھتے ہوئے قلم کا سر ندامت سے جھکا جاتا۔ اور شرم و حیا آنکھیں بند کر کے وہ پردے کھولتی ہے کہ دل امان مانگتا ہے۔ اس قوم کی شہرت کا آوازہ بے شک صدیوں فضائے عالم میں گونجتا رہا۔ اور انکے شہنشاہوں کا اقبال سالہا سال سکندری اقبال سے شرط باندھے رہا۔ بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی اونچا نکل گیا لیکن یہ صورت اس وقت تک رہی۔ جب تک انہوں نے اپنی آنکھوں میں بصیرت کا سرمہ لگائے رکھا۔ اور جب انہوں نے اپنی عقل کی آنکھ میں خاک جھونکی۔ اور غفلت کی روئی کانوں میں دی۔ تو پھر ان کی ساری عزت خاک میں مل گئی۔ ؎

تھا تو یہ خاک مگر کان میں کچھ غفلت نے
ایسی پھونکی کہ ہوا میں یہ لبشر آ ہی گیا

لباس پوشیدنی بھی دولت مندی کا ایک مظہر ہے۔ جس کے پاس روپیہ پیسہ ہوگا۔ وہ لباس میں بھی نفاست کا جویاں ہوگا۔ جس غریب کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوتا ہو۔ اُسے تن ڈھکنے کو بھی کپڑا کہاں میسر آسکتا ہے جس دوزمیں رومتہ الکبریٰ

کا انحطاط شروع ہوا۔ اس میں رومی قوم کو عمدہ عمدہ کپڑوں سے بھی دل بستگی پیدا ہوگئی تھی۔ اور ان میں نفاست کا رنگ زیادہ آگیا تھا۔ سیکھیا[1] کے جنگلوں میں ایک اعلےٰ قسم کا سمور ہوتا ہے۔ وہ رومیوں کے تن کے استعمال کے لئے بصرف زر کثیر لایا جاتا۔ بابل اور مشرق کی قالینیں شہرہ آفاق تھیں۔ وہ رومی گھروں کی زیب و زینت کے لئے دور دور سے منگوائی جاتیں۔ اسی طرح قیمتی پتھر بھی جہاں سے میسر ہوتے لائے جاتے تھے گویا اب رومیوں کی عقل پر ہی پتھر پڑ گئے تھے۔ اور اُن کی بصیرت کی آنکھوں پر جہالت کا پردہ آگیا تھا۔ اور اُن کے جسم سے تقویٰ کی عبا اتارے جا کر انہیں فسق و فجور کی قبا پہنائی جا چکی تھی۔ ان اگلے وقتوں کے سلجھے ہوئے اور اب کے بگڑے ہوئے رومیوں میں رات اور دن کا فرق تھا۔

فن تعمیر کا بھی فراوانی زر کے ساتھ ایک گہرا لگاؤ ہے۔ شداد کا شہرہ آفاق باغ ارم جو روئے زمین پر بہشت بریں کا ایک نمونہ تھا۔ فن تعمیر کا ایک عجیب کارنامہ تھا۔ شداد نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کیا۔ مگر اس کے ان تمام کارناموں کا تمتہ باغ ارم تھا۔ یہ باغ بہشت عدن سے پہلو مارتا۔ بلکہ بہشت بہشت کا منہ چڑاتا تھا۔ شومئی قسمت دیکھیے کہ اس باغ کے ختم ہوتے ہی اسکا اپنا بھی خاتمہ ہوا۔ اور اس کا بنا بنایا باغ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ امیر ؎

---

[1] Scythia ۔ ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر رڈورڈ گبن جلد اول ۔ ص ۵۶ ۔

کہاں ہے دارِ فنا میں قرار کی صورت
نمودِ عمر ہے برق و شرار کی صورت

قومِ ثمود کو بھی تعمیرات سے خاص دلبستگی تھی۔ اور انکی یہ بڑھی ہوئی دلبستگی اُنکے فسق و فجور پر مُہر توثیق ثبت کر چکی تھی۔ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر مکان بنانا اور ہموار زمین پر اونچے اونچے محل کھڑے کر دینا انکی قومی افتاد تھی۔ رومیوں کا زوال دنیا کے سامنے ہے۔ یہ زوال اُن کا شاہ اگسٹس کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اِس بادشاہ کا اصلی نام اکٹیونیسس[1] تھا۔ اس کے عہد میں فنِ مصوّری اور تعمیر میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اور جا بجا اعلےٰ اعلےٰ قسم کی سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی گئیں۔ اس نے خود دارالخلافہ کی سرکاری عمارتیں سنگ مرمر سے بنوائیں۔ اور درست کرائیں۔ کیس[2] اور نیرو[3] نے بھی عمارتوں پر بے دردی سے روپیہ صرف کیا۔ نیرو کا طلائی محل تاریخ میں مشہور ہے۔ اٹلی اور دیگر صوبوں میں جو آثارِ قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ ان سے اِس قوم کے اندر فنونِ لطیفہ کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے[4]۔ اگسٹس کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے۔ وہ فنِ تعمیر کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے تعمیری کارنامے پڑھ پڑھ کر اچنبا ہوتا ہے۔

---

[1] octavians [2] Cauis [3] Nero

[4] ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر از گبن جلد اول صفحات ۴۷ و ۴۸۔

کہ اِن بادشاہوں کو گرا کر بنانے اور بنا کر گرانے اور ایک وضع کی تعمیر کو دوسری وضع کی تعمیر میں تبدیل کرنے اور قسم قسم کی عمارتیں بنانے کی کیا بیماری لگ گئی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ جن بادشاہوں کو قوم کے بنانے اور سنوارنے کا خیال ہوتا ہے وہ ملکی فتوحات سے فارغ ہو کر قوم کے تعمیری پروگرام میں لگ جاتے ہیں۔ اور ان کا زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ قوم کی عقلانی اور اخلاقی حالت بلند ہو اور قومی عزت و عظمت بڑھے۔ لیکن جن بادشاہوں کا زاویہ نگاہ تعیش ہو۔ وہ خود بھی گرتے جاتے اور قوم کو بھی گرائے جاتے ہیں۔ وہ چونکہ اپنے لئے سدھار کا کوئی کام نہیں پاتے۔ اس لئے وہ پرانی عمارتیں سدھارتے اور نئی اور بناتے ہیں۔ کھانے پینے اور پہننے میں لفاست کے متلاشی رہتے۔ اور عیش کیشی کے سب سامان مہیا کر لیتے ہیں۔ شہنشاہ کیس[۱] کے تعمیری ولولے کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بنانا پیدا کرنا ہے۔ اور پیدا کرنا خدا بننا ہے۔ اُسے اپنی نسبت الوہیت کا وہم ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے وہ تعمیرات کی طرف زیادہ متوجہ رہا۔ اس نے اگسٹس کے اس عظیم الشان مندر کی جس کی بنیاد اُس کے پیشرو شہنشاہ نے رکھی تھی تکمیل کی۔ اور پانپی[۲] اس کا تھیٹر جو ناگہانی آگ سے جل گیا۔ پھر سے بنوایا۔ اُس نے اپنے لئے ایک نیا تھیٹر سپٹا[۳] کے مقام پر طیار

Septa ۳؎ Pompeus ۲؎ Caius ۱؎

کروایا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال سما گیا تھا کہ جس طرح سے بھی ہو سکے روم کو سجایا جائے۔ اور اس میں بجائے خود بہت سے انطاکیہ[1] ایک اور اسکندریہ پیدا کر دیئے جائیں۔ اس نے شہر میں پانی لانے کے لئے کوئی چھپن میل کے فاصلے پر سے دو بڑی بڑی نالیاں ایک دوسرے کے اوپر سو سو فٹ اونچی محرابوں پر بنوائیں۔ صوبوں میں بھی اُس نے اعلےٰ اعلےٰ عمارتیں بنوانی شروع کیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا خیال تھا کہ البینز پہاڑ کے درّوں میں ایک شہر بسایا جائے۔ اُس نے اپنے محل کی بھی بہت توسیع کی اور اس قدر مزید دالان اور کمرے بنوائے کہ کسٹر[2] اور پولکس[3] کا مندر اُس کی ڈیوڑھی بن گیا۔ یہ دو دیوتا شہر کے محافظ سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ جو اپنے آپ کو کسی دیوتا سے کم نہ سمجھتا تھا۔ اِن دونو کے بیچ بیچ میں بیٹھتا اور آنے جانے والوں سے خراج پرستش حاصل کرتا۔ دیوتا مشتری کی مورتی ایک مقدس پہاڑی پر مندر میں رکھی ہوئی تھی۔ اس تک پہنچنے اور اس سے ہم کلام ہونے کے لئے اُس نے عمارتوں کے اوپر اوپر سے ایک بہت بڑا پل بنوایا۔ یہ پل بہت اونچا تھا۔ اور روم کے نادر عجائبات سے شمار ہوتا تھا۔ اس نے ایک کام اور بہت عجیب کیا۔ خلیج بے[4] پر کشتیوں کا ایک پل دو میل سے زیادہ لمبا بنوایا۔ اس کا مفصل حال تاریخوں میں موجود ہے۔ اُس نے آس پاس

---

۱ Antioch ۲ Castor ۳ Pollux

۴ Baie

کی تمام بندرگاہوں سے بے شمار کشتیاں لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیں۔ اور ان کی ڈھیری قطار لگا کر اُن پر لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر ڈالے۔ اور اُن پر پتھر اور سیمنٹ لگا کر فراخ راستہ بنوایا۔ درمیان میں کئی سٹیشن رکھے گئے۔ جہاں ایک نالی کے ذریعے پانی بھی پہنچایا گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کشتیوں کی کوئی قیمت ادا نہ کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کو سخت دھکا لگا اور اٹلی میں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کیلیس کے بعد کلاڈیس[۱] اور کلاڈیس کے بعد نیرو بادشاہ ہوا۔ ۶۴ء میں شہر روم میں آگ لگ گئی۔ اور اس کا بہت سا حصہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ لوگ شک کرتے تھے کہ یہ آگ خود نیرو نے لگوائی۔ کیونکہ وہ اپنا محل وسیع کرنا چاہتا تھا۔ کچھ حصہ شاہی محلات کا بھی آگ کی نذر ہو گیا تھا۔ شہنشاہ نے چار سال کے اندر اندر نیا روم اور نئے محل بنا کر کھڑے کر دیئے۔ شہر کی زمین کا بہت سا حصہ محلات کے اندر ڈال لیا گیا۔ محلات کا گذرخانہ بہت وسیع کیا گیا۔ اور اس میں کئی باغ۔ حمام۔ تالاب اور فصیلیں آ گئیں۔ جو قصر نیا تیار ہوا اُس کا نام سنہری قصر پڑ گیا۔ اُسے باہر سے سنہری چھتوں اور طرح طرح کے نقش و نگار اور قسم قسم کی صنعت کاریوں سے سجایا گیا۔

لہ رومن امپائر از چارلس مریول۔ جلد ۵۔ ص ۱۵ اہم تا ۴۲۴

House of Passage ۲ے   Claudius [illegible] لہ

اندر کا حصہ نقاشی، سنگ تراشی، بت تراشی اور قیمتی پتھروں کی وجہ سے نگار خانہ چین کو مات کرتا تھا۔ ڈیوڑھی پر شہنشاہ کا سنگ مرمر کا بت زمین سے ایک سو بیس فٹ اونچا نصب کیا گیا۔ جب شہنشاہ پہلی بار اس محل میں داخل ہوا۔ تو بولا کہ اب مجھے ایک مکان میسر آیا ہے۔ جو آدمی کو ملنا چاہئے[۵۱]۔ اب سنئے کہ جو روپیہ ان محلات پر خرچ ہوا۔ وہ کہاں سے آیا۔ شہریوں، حلیفوں۔ اور تمام جماعتوں سے جبری عطیات حاصل کئے گئے۔ اور جو دینے سے انکار کرتا۔ اس سے اور بھی زیادہ وصول کیا جاتا۔ سرکاری خزانوں کے علاوہ مندروں کے تمام خزانے لے لئے گئے۔ اور یونان اور ایشیا سے دیوتاؤں کی طلائی مورتیاں تک اٹھا لائی گئیں۔ اور شہنشاہان سلطنت کی پرانی یادگاریں اور انکی قیمتی قیمتی نشانیاں بھی بیچ ڈالی گئیں۔ نیرو کے بعد جس قدر بادشاہ ہوئے وہ کم و بیش اپنے پیشرووں کے قدم بقدم چلتے رہے۔ اور انہوں نے بھی اپنا ولولہ تعمیر کسی طرح مٹنے نہ دیا۔ اور وہ مٹا اُسی وقت جب وہ خود مٹ گئے[۵۲]۔ ہندوستان کے مغل شہنشاہ جب تک سادگی پر رہے۔ انکی حکومت اوج موج پر رہی۔ تیمور سے لیکر اکبر تک کا زمانہ انکی ترقی کا زمانہ تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت سے اس خاندان کا زاویہ نگاہ بدلا۔ اور اُس میں عشرت پسندی نے راہ لی۔ جہانگیر کی عیش کیشی اور میگساری ضرب المثل ہے۔ اسی وقت سے مغلوں نے تعمیرات پر بے دردی سے

---

[۵۱] رومن امپائر از مرویل۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۱ [۵۲] رومن امپائر از مرویل۔ جلد ۶۔ ص ۱۶۵ تا ۱۷۱

روپیہ صرف کرنا شروع کیا۔ تاریخ کہے دیتی ہے۔ کہ مغلوں کی اعلےٰ اعلےٰ تعمیرات جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کی یادگاریں ہیں۔ اسی وقت سے اُن کا دورِ انحطاط شروع ہوتا ہے۔ مصر میں جو اونچے اونچے مینار اب بھی کھڑے ہیں۔ وہ اُس وقت کی تہذیب کی جھلک دکھاتے اور اُس وقت کے مصریوں کی قومی پستی کا پتہ دیتے ہیں۔ آج سے کوئی تین چار ہزار سال پہلے مصریوں کا تمدن کمال عروج پر تھا کسی قوم کے یہاں فنِ تعمیر میں اس وقت چار چاند لگتے ہیں۔ جبکہ وہ ارتقا کی آخری منزل طے کر کے دورِ انحطاط میں داخل ہونے لگتی ہے۔ ہندِ عتیق پر بھی ایک زمانہ ایسا ہو گذرا ہے۔ جبکہ اس کی تہذیب ارتقا کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی تھی۔ یہ زمانہ حضرت مسیح سے بہت پہلے ہو گذرا ہے۔ اہلِ تحقیق کی رائے ہے کہ ہندیوں نے فنِ تعمیر کو اٹھا اٹھا کر اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ اس وقت دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہ کر سکتی تھی۔ یہ وقت غالباً وہی تھا۔ جبکہ اُسکے تمدن کا زوال شروع ہوا۔ اور پھر یہ تمدن ایسا مٹا کہ آج اُسکے آثار بھی ناپید ہیں۔

موسیقی کے عروج کا زمانہ بھی قوم کے انحطاط کا زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس شغل سے اُس قوم کو زیادہ روشناسائی ہوتی ہے جس کی گھٹی میں آرام طلبی پڑ جائے۔ جو قوم ضروریاتِ زمانہ سے آگاہ ہو کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتی ہو۔ اُسے عیش و آرام سے کیا کام! بہادر اور فائز المرام قوم کا طرۂ امتیاز اس کی سپاہیانہ روح اور سادہ مانہ ولوہ ہوتی ہے سپاہ گری اور سادگی کے آگے موسیقی کا کیا کام!

موسیقی تو وہاں ہی رنگ پکڑتی ہے۔ جہاں قوم تلوار چھوڑ کر آلۂ تغنّی ہاتھ میں لے۔ اور جنگی ولولہ چھوڑ کر مضراب کا طنطنہ پیدا کرے۔ تاریخ ہند شاہد ہے کہ محمد شاہ رنگیلے نے اپنے رنگیلے پن اور موسیقی کی بدولت اپنی اتنی بڑی سلطنت کھو دی تھی۔ اس ایک پر ہی کیا منحصر ہے۔ سب قوموں اور سب بادشاہوں کا تباہی کے وقت یہی حال رہا ہے رومن قوم سے بڑھ کر کس نے عروج کا زمانہ دیکھا۔ اور رومن شہنشاہوں سے بڑھ کر کس نے عزت و عظمت کی گود میں پرورش پائی۔ لیکن جب اُن کی تباہی کے دن بھی نزدیک آئے تو پھر اُن کا عروج۔ اُن کا اقبال۔ اُنکی عزت اُن کی عظمت سب خاک میں مل گئے۔ اور اخلاقی انحطاط کا وہ دور دورہ شروع ہوا۔ کہ باید و شاید۔ رومن تاریخ میں نیرو ایک بڑا ظلم پرست اور عشرت پسند بادشاہ ہو گذرا ہے۔ اس نے ۵۴ء میں تخت سنبھالا تو گویوں اور مسخروں کا سوانگ نکالا۔ وہ بادشاہ نہ تھا بلکہ پورا گویا اور پورا بھانڈ تھا۔ اس نے اپنے محل میں ایک تھیٹر اور ایک سرکس بھی بنوایا تھا مورخ لکھتے ہیں کہ یہ اس قدر بے شرم اور بے حیا تھا کہ اپنی رعایا کے سامنے گاتا بجاتا اور ناچتا۔ اس کی جدت طبع دیکھئے کہ اس نے لوگوں کو اپنا گانا سنانے اور ناچ دکھانے کے لیئے ایک نیا تیوہار قائم کیا۔ جو وہ اپنے محل کے اندر مناتا۔ جوانی میں اس نے اپنی داڑھی نوچ ڈالی۔ اور جو نرم بال اُترے وہ سونے کی طشتری میں رکھ کر اپنے قدیمی دیوتا مشتری کے نذر کیئے۔ اس پر یہ تیوہار منایا گیا۔ اس تیوہار میں سب قسم کے لوگ عام و خواص شامل ہوتے۔ بادشاہ خود گاتا، بجاتا اور ناچتا

اور اسکے درباری بھی گاتے اور ناچتے۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھیل اور قسم قسم کے تماشے ہوتے۔ اس نے دریا ٹائبر کے ایک طرف ایک باغ بنوایا۔ جہاں لوگوں کو قسم قسم کے کھانے اور طرح طرح کے پانی ملتے۔ اس میں مرد و عورت دونوں شریک ہوتے۔ مورخین کی رائے ہے کہ اب بے حیائی اور بدچلنی حد سے گذر گئی تھی اور ذکور و اناث کے اس اختلاط سے عوام الناس کے اخلاقی انحطاط کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ اُس نے گانے بجانے پر ہی بس نہ کی۔ بلکہ گانے بجانے میں مقابلہ کی ایک مجلس بھی قائم کی۔ جس میں وہ خود بھی شامل ہوتا۔ اُس نے گانے میں وہ مہارت بہم پہنچائی تھی۔ کہ بڑے بڑے گائک اور ناٹک بھی اسکے آگے کان پکڑنے لگے۔ بھلا ایسے گنی گنوان کے آگے کون ٹھہر سکتا تھا۔ آخر مقابلہ میں جیت اُسی کی ہوتی۔ اسکے درباری بہت کوشش کرتے۔ کہ بادشاہ مقابلہ کئے بغیر ہی انعام قبول کرلے۔ تاکہ لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچ جائے۔ مگر وہ اصرار کرتا۔ اور کہتا کہ میں کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ پھر وہ سٹیج پر آکر ایک غزل تحت اللفظ پڑھ دیتا۔ اس پر لوگ اصرار کرتے کہ غزل گانے کے تمام لوازم سے ادا کی جائے۔ پھر وہ اُن کے سامنے گاتا اور ناچتا۔ لوگ بھی بادشاہ کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک تال اور سُر کو اشاروں آوازوں اور نعروں سے آسمان پر اٹھا لے جاتے اور تالیاں بجاتے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ قومی عزت و حرمت کا خون ہوتا دیکھ کر تالیاں بجانے سے ہچکچاتے۔ اور ان سپاہیوں کے ہاتھوں جو

تماشائیوں کے اندر جا بجا متعین ہوتے ۔ پٹ جاتے ۔ اور نوبت یہاں تک پہنچتی ۔ کہ بہت سے نا تٹ باہر نکلنے کی کوشش میں نیچے لتاڑے جاتے ۔ اس بادشاہ کی گراوٹ کا حال پڑھ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ اس کے دربار کی زیب وزینت بہادر جرنیلوں اور لایق و مدبر اراکین سے نہ تھی ۔ بلکہ اس کا تخت گویوں ۔ ناچنے والوں تماشہ کرنے والوں اور بدچلن وزیروں سے گھرا ہوا تھا ۔ ان رومی شہنشاہوں کے دربار کا یہ رنگ آگے جاکر گھٹ بھی جاتا رہا ۔ لیکن رومن سوسائٹی کو جو عیش وعشرت کی بیماری ایک دفعہ لگ گئی تھی ۔ وہ کبھی اچھی نہ ہوئی ۔ بلکہ وہ موقعہ پاکر بڑھتی ہی رہی ۔ آخر اسکے ہاتھوں وہ ایسی اوندھی گری ۔ کہ اسکی پستی اسکی بلندی سے کسی طرح کم نہ تھی [1] ذوق ؎

ثبات کب ہے زمانے کے عزوشاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

شاعری قوم کے ہر دور میں کم وبیش سر نکالتی ہے ۔ لیکن ہر دور کی شاعری اس دور کے قومی اعتقادات اور خصایل وعادات کی سچی تصویر ہوتی ہے ۔ جاہلیت کا زمانہ عرب کی سحر آفرین شاعری کا ایک مشہور زمانہ گنا جاتا ہے ۔ اس زمانہ کے اشعار قوم کی اخلاقی ۔ معاشرتی اور عقائی حالت کا نقشہ کھینچ دیتے

---

[1] تاریخ رومن امپائر از چارلس مرویل ۔ جلد ۶ ۔ ص ۱۲۸ تا ۳۱۰

ہیں۔ اگر ہمارے پاس اس وقت کی تاریخ بھی نہ ہوتی۔ جب بھی ہم اُس وقت کے متفرق اشعار سے اُس عہد کی تہذیب و تمدن کا سیاہا پیش کر سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کے شعراء کی زبان دانی اور طلاقت لسانی پر حرف نہیں رکھا جا سکتا۔ اُن کی زبان مشکل اور دور از کار استعارات کے اینچ پیچ سے فارغ ہے اُن کے سلسلہ خیالات میں کہیں نام کو بھی جھول نہیں۔ اور نہ ان کے سلسلہ بیان میں کوئی گتھی پڑی نظر آتی ہے۔ اُن کے کلام میں نبوٹ کا رنگ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اُن کی زبان منجھی ہوئی اور کوثر کی دُھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر خیالات کے ہجوم کا اور کلام کی روانی کا وہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امڈا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے کہنا چاہیئے کہ فصاحت اُن کے قدموں پر نثار ہوئے جاتی اور بلاغت اُن کے پاؤں میں لوٹے جاتی ہے۔ تو گویا اُنکے کلام میں بندش کی صفائی۔ ترکیب کی دلاویزی۔ نشست کی چستی۔ بیان کی روانی تشبیہات و استعارات کی سادگی و رنگینی اور خیالات کا اچھوتا پن سب کچھ ہے۔ مگر یہ کیا اندھیر ہے کہ ان کے تخیل کی جولانگاہ تعیش ہی تعیش اور انتقام ہی انتقام ہے۔ زمانے نے بے شک ان کا کلام اچھالا۔ اور خوب اچھالا۔ مگر ایسا اچھال صرف دودھ کا اُبال اور عنوان زوال تھا۔ کیونکہ سچی شاعری تو وہی ہوتی ہے جس سے حقیقی مسرت حاصل ہو۔ اور سننے والے کے دلوں کو عروج ہو۔ مگر ان کی شاعری میں یہ بات ہی عنقا تھی۔ اُن کے قصائد کی ابتدا

ہی تو عشق سے ہوتی ہے۔ عشق سے نہیں فسق سے ہوتی ہے جسے ان عرب عربا کی زبان میں تشبیب کہتے ہیں۔ ان کے یہاں کا ہر ایک شاعر اپنے کلام کی ابتداء اپنی معشوقہ کے ذکر سے کرتا ہے۔ امراء القیس جاہلیت کے شعرا کا سرغنہ تھا۔ اُسے فسق و فجور کی لت پڑی ہوئی تھی۔ اور یہی لت اُس کی موت کا باعث ہوئی۔ وہ اپنی چچا زاد بہن کو بھی جو بڑی حسین تھی۔ دام تزویر میں لانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے مشہور قصیدے میں جو سبعہ معلقہ میں سے ایک ہے۔ کہتا ہے۔

۱۔ میں اس وقت کو نہ بھولوں گا۔ جبکہ میں نے کنواریوں کے لئے اپنی اونٹنی ذبح کی۔ الخ[1]

۲۔ میں وہ دن نہ بھولوں گا جبکہ میں عنیزہ کے ہودے میں گھس گیا۔ وہ بولی تو ہلاک ہو۔ تو تو مجھے پیدل کردے گا[2]

۳۔ تیری جیسی بہت سی حاملہ اور دودھ پلانے والیاں تھیں کہ میں ان سے ہمکنار ہوا اور اُن کو ایک سالہ تعویذ والے پیارے بچوں سے اپنی طرف پھیر لیا[3]

---

[1] ویوم عقرت للعذاری مطیتی ۔ فیا عجباً من کورھا المتحمل ۔

[2] ۔ ویوم دخلت الخدر خدر عنیزۃ ۔ فقالت لک الویلات انک مرجلی

[3] ۔ فمثلک حبلیٰ قد طرقت ومرضع ۔ فالھیتھا عن ذی تمائم محول ۔

۴۔ میں نے اُسے زلفوں سے اپنی طرف کھینچا۔ تو وہ کھچ آئی۔ حالانکہ وہ کمر کی پتلی۔ اور جسم کی موٹی تازی تھی۔[۵] یہ شاعر اسی طرح پے درپے کئی شعروں میں اپنی معشوقہ کے راز و نیاز بیان کئے جاتا ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ فنافی الفسق ہو چکا ہوا تھا۔ صنف نازک کے خلاف اِس قسم کا ناپاک مظاہرہ بھلا شاعری کی کسی صنف میں داخل ہے۔ جس شاعر کا کلام اس درجہ حیا سوز واقع ہوا ہو۔ اُسے انسانیت سے کیا علاقہ!! غالب ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یہ لوگ جب اپنے شاعرانہ جوہر دکھانے پہ آتے ہیں۔ تو بظاہر تو بہت دور کی کوڑیاں لاتے ہیں۔ مگر جب صرافِ معنی کا ادبی ذوق انکے اشعار پرکھنے پر آتا ہے تو پھر وہ کوڑی کوڑی کو بھی مہنگے دکھائی دیتے ہیں۔ اِس زمانہ کے جس شاعر کا دیوان اٹھا کر دیکھو یہی حالت نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر حماسہ کا باب التشبیب ملاحظہ ہو۔ وہاں انکی ہوس رانی اور فسق پرستی کا وہ مکروہ رنگ نظر آئے گا۔ کہ پناہ بخدا۔ میگساری اِس قوم کی گھٹی میں پڑی تھی۔ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔ کہ جو قوم شراب کو باعث افتخار سمجھے۔ اُس کی اخلاقی حالت کیا ہو گی۔

---

[۵] حضرت بغوی راسھا فتماملیت۔ علی ھضیم الکشح ریا المخلخل۔

گویا زن پرستی۔ شراب نوشی۔ جنگ جوئی۔ غارت گری۔ انتقام گیری۔ مہمان نوازی جاہلیت کے عربوں کا طغرائے امتیاز تھا۔ فسق و فجور قوم پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ بیٹا باپ مرے پیچھے ماؤں کو اپنی مملوکہ سمجھنے لگتا تھا۔ عورتوں کی خاطر وہ اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر برے سے برا کام کر ڈالتے تھے۔ قتل و غارت اُن کا ذریعہ معاش تھا۔ فوجی ولولہ بہت بڑی حد تک اُن میں موجود تھا۔ مگر اس کا محل استعمال نہایت زبون تھا۔ یعنی ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ اور پھر یہ سلسلہ جنگ سالوں میں بھی ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔ اِن میں انسانیت کی اگر کوئی علامت باقی رہی تھی۔ تو وہ مہمان نوازی تھی۔ مگر اس نے بھی دورِ آسلا کے آخری حصے میں مذموم صورت اختیار کر لی تھی۔ یہ تمام باتیں اُس وقت کے شعرا کے کلام سے صاف ٹپک رہی ہیں۔ عرب پر اس سے زیادہ ناپاک زمانہ پہلے کبھی نہ آیا ہوگا عین اُس وقت جبکہ ظلمت کی گھٹائیں سارے عرب پر چھا رہی تھیں۔ کوہِ فاران سے اسلام کا آفتاب چمکا۔ جس سے یہ ساری ظلمت یک قلم مِٹ گئی۔ اسلام کے آنے سے شراب نوشی تو بالکل موقوف ہوئی اور حسن پرستی اُسی حد تک باقی رہی جس حد تک کہ اسلام نے جائز رکھی ہے۔ جنگ جوئی۔ مہمان نوازی۔ اِنتقام گیری اور غارت گری پھر بھی باقی رہیں۔ مگر اُن کے مظاہر بہت بڑی حد تک بدل گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اخلاق اساسی کا بالکل بدل دینا قریباً ناممکن ہے۔ البتہ انکے مظاہر و مواقع میں مناسب تغیر ہو سکتا ہے۔ اور

بعینہ یہی کام اسلام نے کیا۔ اسلام نے ایک طرف عربوں میں تحریم خمر اور تحدید ازدواج سے سادگی پیدا کر کے پھر سے زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اور دوسری طرف انکے ملکہ عسکریت اور اُن کی قوتِ انتقام گیری کو منظم و منضبط کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایرانی۔ رومی اور آس پاس کی سلطنتوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور اپنا نام صفحہ روزگار پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔ اس عروج کے زمانے میں مسلمانوں میں شاعری کا ذوق بہت کم ہو چلا تھا اور جو کچھ باقی بھی رہا تھا۔ اُس کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ شعرائے اسلام لبید۔ حسان بن ثابت۔ کعب بن زبیر اور حضرت علیؓ کے کلام سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں سُوقیانہ تغزل کا رنگ جذبات ذمیمہ۔ شراب اور فسق و فجور کی مدح سرائی بالکل ناپید ہیں۔ بلکہ اُن کا کلام پند و نصائح اور عشق حقیقی کے رموز و لطائف سے لبریز ہے۔ کسی کا دیوان اٹھا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ شعر نہیں کہے ہیں۔ موتی پروئے ہیں۔ یا اس ورق نیلگوں سے تارے اتار کر صفحہ قرطاس پر رکھ دیئے ہیں۔ ان کے اشعار دیکھنے سے یہ بات آئینہ ہوتی ہے کہ معانی پنہانی اور رموز و اسرارِ حقانی کو زبان کی صفائی اور پاکیزگی میں سمو کر ذائقہ روح کے لئے اک جان پرور سامان پیدا کیا گیا ہے۔

تیسرا باب

دادگستری و انصاف پسندی

انصاف پسندی کے دو پہلو۔ رومن قوم کا زوال تحریک سوشل ازم۔ انقلاب فرانس امریکہ کی آزادی۔ روس کا انقلاب جرمنی کی حالت ترکی کی جمہوریت۔ مساوات

جو قوم آسمان شہرت پر تارہ بن کر چمکے گی۔ اس میں عدل و انصاف کا ملکہ بہت بڑھا ہوا ہوگا۔ اِس انصاف کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ قوم اپنے افراد کے ساتھ اپنائیت کی راہ میں ہو اور اُن سے مساوات کا طریق سلوک رکھے۔ یعنی یہ نہ ہو۔ کہ آدمی کو آدمی کھائے جائے اور بھائی بھائی کا پہلو دبائے جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ مساوات و حریت کی شاہراہ پر گامزن ہو کر ہمسایہ قوموں کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی استعمار پرستی کی جولانگاہ نہ بنائے۔ بلکہ سرتوڑ کوشش اِس امر کی کرے کہ دیگر قومیں بھی اس کے ساتھ کلہ بہ کلہ اور پہلو بہ پہلو حریت و آزادی کی راہ پر قدم ماریں جس قوم میں یہ دونو پہلو انصاف کے ہونگے۔ اس کا ملکہ ضبط نفس سلجھا ہوا ہوگا اور اس کا ستارہ اقبال کبھی غروب نہ ہوگا۔ ہم عدل و انصاف کے اِن دونوں

پہلوؤں پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالا چاہتے ہیں۔ اِس لئے ہر ایک پہلو کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں۔

اوّل۔ ایک قوم کا دوسری قوموں سے برابری کا سلوک کرنا۔ جو قوم دوسری کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر کے یا آزاد کرا کے حریت کی شاہراہ پر لا ڈالیگی۔ وہ بڑی بلند بخت ہوگی۔ ایسی قوم کا اس وقت دنیا میں ملنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایسی قوم وہی ہونی چاہئے۔ جو بے جا استعمار پرستی کو خیرباد کہہ کر اور کشمکش حیات کی الجھنوں سے نکل کر حرّیت و مساوات کی مشعل بردار ہوئی ہو۔ اِن دنوں۔ فرانس۔ اٹلی۔ امریکہ اور جاپان وغیرہ کا ستارہ اقبال بلندی پر ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے اُن میں ملکی دائرہ کو وسعت دینے کی پالیسی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ وجہ یہ کہ اُن کی فیکٹریوں اور کارخانوں سے جو مال و اسباب طیار ہو کر نکلتا ہے۔ اُس کے لئے ہندوستان۔ عراق۔ مصر۔ افریقہ۔ آسٹریلیا مراکو۔ شام۔ عرب۔ چین۔ ایران اور کینیڈا وغیرہ منڈیاں ہیں۔ جہاں ان کی سطوت کا جال بچھا ہوا ہے۔ جہاں جہاں اِن جری اقوام کا قدم پہونچا وہاں وہاں کے لوگوں نے تاب مقاومت نہ لا کر اُن کے آگے سپر ڈالدی۔ اور نئی روشنی اور نئی تہذیب کے میدان میں گام زنی شروع کی۔ اِن قوموں کی خودغرضی کا پہلو ان کی خیر خواہی سے اونچا ہو تو ہو۔ مگر اس سے کسی طرح بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اِن مفتوحہ قوموں کو ارتقاء کے میدان میں لا ڈالا ہے۔ خدا کرے اِن مفتوحہ

قوموں کی آزادی کی روح نہ کچلی جائے۔ اور وہ اِس نظریہ کو خیال میں ہی نہ لائیں۔ کہ جن قوموں کی کارکنان قضاوقدر سے ایک دفعہ ٹھن جائے۔ اُن کا دام آرزو حرص نہیں بچھا رہ سکتا۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں۔ جبکہ جبرو استبداد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا مطلع دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ اور دنیا کی تمام قومیں آزادی کی ہوا میں سانس لیں گی۔ اِن فاتح قوموں کی یہ ساری جھنجھناہٹ زیادہ تر اِس لئے ہے کہ اُن کے یہاں سرمایہ کی فراوانی ہے۔ جسے وہ مختلف قسم کے کارخانوں میں لگاتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اِن کارخانوں کے بنے ہوئے سامان کی فروخت کو ان کی اپنی منڈیاں بس نہیں کرتیں۔ اور نہ ان کے اپنے ملک میں کروڑوں اور اربوں کے سامان کی کھپت ہو سکتی ہے۔ اِس لئے اِن ملکوں کا زاویہ نگاہ جہاں سلطنت کو وسعت دینے کا ہے۔ وہاں اپنے ساز و سامان کے لئے بیرونی منڈیاں پیدا کرنے کا بھی ہے۔ اِس پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اِن ملکوں کی بنی ہوئی چیزیں اِن تمام جگہوں میں جہاں جہاں انہیں اقتدار حاصل ہے۔ مہنگے داموں بکتی ہیں۔ اور اس کے عوض وہاں کی خام پیداوار اُن کے یہاں کوڑیوں کے مول جاتی ہے۔ اور اِس طرح اِن غریب ممالک کی اپنی صنعت وحرفت کی کساد بازاری ہو رہی ہے۔ جس جس جگہ حکومت ملک کی اپنی ہے۔ وہاں ایسا ہوا اور ہو رہا ہے۔ کہ ملکی صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ دینے کیلئے دوسرے ملکوں کی اشیاء کا استعمال کسی نہ کسی طرح روکا گیا۔ اور روکا جا رہا ہے

قوموں کو اقتصادی مشکلات سے بچ نکلنے کے لئے ایسا کرنا پڑجاتا ہے۔ ایران میں آج کوئی غیر ملک کا باشندہ قدم رکھے تو اُسے ایرانی کپڑے کا لباس پہننا پڑتا ہے۔ ایک وقت انگلستان نے بھی اپنی پارچہ بافی کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کے ریشمی اور سوتی کپڑے کی درآمد پر محصول لگا دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل انگلستان میں کلوں اور انجنوں سے زیادہ کام لیا جاتا تھا لیکن جب ان سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ تو پھر انگلستان کی پارچہ بافی کو بہت فروغ ہوا۔ اور اس مال کے ساتھ ہندوستانی مال کیا بلحاظ ارزانی۔ اور کیا بلحاظ صفائی پورا نہ اُتر سکا۔ اب ہندوستانی پارچات پر زیادہ محصول لگانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟[۵]

"مغربی قومیں جو نئی روشنی کی مشعل بردار ہیں۔ اس بات کا دعوےٰ رکھتی ہیں کہ جہاں وہ جائیں علم اور روشنی پھیلائیں اور ساتھ ہی وہاں سے کچھ نہ کچھ مادی فایدہ بھی اٹھائیں" یہ بات کوئی مغربی قوموں پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ ہر ایک قوم کو جو اپنی اقتصادی الجھنیں وا کرنے پر مجبور ہو۔ مسایل ملکی کی آڑ میں اس قسم کی کارروائیوں پر اتر آنا پڑتا ہے۔ ایسے کڑے حالات میں بھی اگر قوم اپنی مالی گتھیاں سلجھانے کا خیال نہ کرے۔ تو پھر سمجھو کہ اس کا ستارہ اقبال گھٹا جا رہا

---

۵ دیکھو علم المعیشت از پروفیسر الیاس برنی۔ ص ۵۹۲ و ۵۹۳۔

ہے اُس کی کشتی حیات سیاسی اور مالی مشکلات کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی جاتی ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ وہ ایک وقت قوموں کی تاجرانہ مسابقت میں پیچھے رہ جائے اور اسکی ساری دولت تجارت کے اُتار چڑھاؤ میں ٹھکانے لگ جائے۔ اس لئے قوم کو قوم بننے کے لئے ان تمام مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور اُسے بہت اونچ نیچ دیکھنا اور زمانے کا گرم سرد سہنا پڑتا ہے۔ گرنا اُبھرنے سے آسان ہے۔ اور گرنے میں اُبھرنے سے وقت بھی کم لگتا ہے۔ لیکن جب قوم گرنے کو آتی ہے تو یکایک نہیں گرتی۔ دہر کجرفتار کو ایک قوم کے گرانے کے لئے بہت سے ڈھنگ ڈالنے پڑتے ہیں۔ ابھرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ایک نونہال چمن کا اُبھرتے ابھرتے کئی دفعہ سر قلم ہوتا ہے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس باغ جہاں میں ایک قوم یوں ہی ہاتھ پاؤں مارتی شاخ گل تک جا پہنچتی ہے۔ کیا سنا نہیں۔ غالب۔ ؎

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ سلجھی ہوئی فاتح قوم مفتوحہ ملک کی تہذیب کو یا تو بالکل تہس نہس کر دیتی ہے۔ یا اس پر اپنا اثر ڈال کر تہذیب و تمدن کا ایک نیا قوام تیار کر دیتی ہے۔ یہ مفتوحہ قوم کے لئے مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ جہاں تک مضرت کا تعلق ہے۔ وہاں تک ایک حکمران قوم آئین داد گستری سے باہر

جاتی ہوئی خیال کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب اس کی اپنی زندگی و موت کا سوال درمیان آجاتا ہے۔ تو پھر وہ بھی کیا کرے۔ عمر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ نہ کرے تو خود ماری جائے۔ کرے تو آئین جہانداری جاتے۔ خود انگلستان اس وقت اس قسم کی جان گسل جدوجہد میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک طرف اُسے مالی مشکلات نے آلیا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کا سیاسی مطلع ابر آلود ہو گیا ہے۔ اور ملک کے سیاسی لیڈر گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کا حربہ لئے قدرت کی قہرمانی قوتوں سے ٹکرے رہے ہیں۔ غالب۔ ؎

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے لے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اگلے وقتوں کی رومن سلطنت کے زوال میں رومیوں کی حد سے بڑھی ہوئی قومی جنبہ داری کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ اِس سلطنت کا دامن بہت پھیلا ہوا تھا چنانچہ اِس کے دائرہ وسعت کے اندر ذیل کے ملک آ گئے تھے۔ (۱) ہسپانیہ (۲) گال (۳) اپر و لوئر جرمنی۔ (۴) برٹش علاقہ (۵) اٹلی (۶) آسٹریا۔ (۷) ہنگری۔ (۸) آسٹریا (۹) کارتھیج (۱۰) کارنیولا (۱۱) تھریس۔ (۱۲) مقدونیہ۔ (۱۳) یونان۔ (۱۴) شام۔ (۱۵) مصر۔ (۱۶) افریقیہ کا بہت سا حصّہ۔

اٹلی رومیوں کا مرز و بوم اور سلطنت کا مرکز تھا۔ اِس لحاظ سے اٹلی اور ماتحت صوبوں میں جو جائز و ناجائز امتیاز رکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ سلطنت کے تمام شعبوں

میں نظر آتا تھا۔ اور مفتوحہ ملکوں کے لوگ اِس امتیاز کو محسوس کرتے تھے۔ بلکہ ان کو یہ امتیاز محسوس کرایا جاتا تھا۔ رومیوں سے چوک کیا ایک بڑی سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ مفتوحہ قوموں کو برابر کے حقوق نہ دیئے گئے۔ بلکہ اُن سے غلامانہ سلوک روا رکھا گیا۔ رومن نسل کے افراد کو خاص خاص حقوق دیئے گئے۔ اور انکی جاگیریں اور زمینیں ٹکسوں سے مستثنےٰ رکھی گئیں۔ اِس امتیاز کو یہاں تک وسعت دیگئی کہ رومیوں کے معاملات کو بھی ماتحت علاقوں کے گورنروں کے اختیار سماعت سے باہر رکھا گیا اِس روش نے مفتوحہ قوموں کے دلوں میں آتش غیظ و غضب بھڑکا دی۔ اور جب رومیوں کا نظام عسکریت ذرا ڈھیلا پڑا۔ تو اِن قوموں کی بربریت نے سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیا۔ اور رومتہ الکبریٰ کے قباء عظمت کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ؎

اے اجل تکلیف مت کر کیا کریگی آن کر
ہو چکی پہلے ہی وہ کشتہ کسی کی آن کا

قوم کا غیروں کے ساتھ عدل و انصاف کا ذکر تو کچھ ہو لیا۔ اب ذرا قوم کے اندر کی مساوات و معدلت کا تھوڑا سا حال بھی سن لیجئے۔ قوم کے بعض افراد کا بعض کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا بھی اسکے اعلےٰ ترین صفات میں داخل ہے جس قوم میں انصاف کا یہ پہلو نہ ہوگا۔ وہ آج نہیں تو کل ضرور ذلت کے گڑھے میں گریگی۔ اِسی مساوات کے تحفظ سے تحریک سوشلزم کی داغ بیل پڑی۔ یہ تحریک کوئی آج کی نہیں بلکہ یہ تو اگلے وقتوں میں بھی ہر قوم کے دور انحطاط میں کسی نہ کسی شکل

میں پھوٹتی رہی ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس کا موجودہ نام سوشل ازم حال کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ یہ اصل میں نام ہے۔ اس اندر کی رقابتی لڑائی کا جو جماعت اور فرد کے مابین ٹھن جاتی ہے۔ یعنی مصالح شخصی کو مصالح اجتماعی پر نثار کر دینا سوشل ازم کہلاتا ہے۔ فرد چاہتا ہے کہ وہ جماعت کے حقوق و مرافق کو قربان کر کے اپنی ذات کے لئے سرمایہ پیدا کرے اور پھر اس سرمایہ کو قومی افلاس کے ہوتے ہوئے ذاتی عیش کشی اور لطف اندوزی پر صرف کرے۔ تو گویا فرد دولتمند۔ حریص اور خودغرض ہے۔ اور جماعت غریب اور بے غرض اس شخصی خودغرضی کا نتیجہ یہ ہے کہ گنتی کے سرمایہ دار تو ادھر اُدھر کی دولت سمیٹ کر اپنی سرمایہ داری کو بڑھاتے رہتے ہیں اور عوام کا کثیر گروہ یعنی زراعت اور مزدور پیشہ لوگ دن بدن افلاس کا شکار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ زر پرستی اور حشمت افروزی قوم میں عام اخلاقی انحطاط پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ کسی شئے کی فراوانی اُسکے بُرے استعمال کی محرک ہو کر رہتی ہے۔ یہاں ایک محدود فرقہ سرمایہ اور زمین کا اجارہ دار ہے جو زمین کو غریب کاشتکاروں سے کاشت کراتا اور اُنہیں معمولی اُجرت یا برائے نام حصہ پیداوار دے کر باقی تمام پیداوار خود اینٹھ لیتا ہے۔ وہ اپنا روپیہ دوسروں کو دے کر یا کسی صنعت و حرفت پر لگا کر مقروض اور مزدور کو بہت کم فائدہ اٹھانے دیتا اور خود بے اندازہ منافع حاصل کر لیتا ہے۔ گویا دولتمند جماعت غریبوں کی گاڑھی کمائی کا بڑا حصہ خود ہڑپ کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی۔ اور غریب مزدور

اور کاشتکار کی زندگی تلخ کرتے دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اس نا مساویانہ سلوک سے سرتابی کرکے دولتمند فرقہ کے خلاف کھلم کھلا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ عدم مساوات اور بے انصافی قریباً ہر قوم کے دور انحطاط میں کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ فرعون کی جماعت بڑی دولتمند تھی۔ جو غریب۔ بنی اسرائیلوں پر طرح طرح کے ظلم توڑتی انکے لڑکے ذبح کرتی۔ انکی لڑکیاں زندہ رکھتی۔ ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتی۔ اور ان کو کسی طرح اٹھنے نہ دیتی تھی۔ عین اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اورنگ رسالت پر جلوہ آراء ہوتے اور بڑے شد و مد سے اس جماعت کے مقابلہ پر آکر اُسے نیچا دکھاتے اور اسکی ساری طاقت کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں۔ دین عیسوی کے آنے سے کچھ عرصہ پہلے یہودیوں نے اپنا دین وملت دینار و درہم قرار دے رکھا تھا۔ اور روپیہ پیسہ اینٹھنے کی تمام راہیں کھول رکھی تھیں۔ اِن کا سلوک غربا کیساتھ ظالمانہ تھا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام تشریف لائے تو اس غریب فرقہ کی حمایت پر کمربستہ ہوئے۔ انھوں نے کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ کہ آسمان کی بادشاہت صرف غریبوں کے لئے ہے۔ حضرت محمد علیہ السلام کے آنے سے پہلے عربوں کی کیا حالت تھی۔ عرب کا ایک حصہ ایرانیوں کا ایک باجگذار علاقہ تھا۔ یہ لوگ ضرورت پڑنے پر عربیوں سے روپیہ۔ دوشیزہ لڑکیاں اور سپاہی حاصل کرتے۔ ان کو اپنی خود غرضی کا آلہ کار بنائے رکھتے۔ اور انھیں کسی طرح سر نہ اٹھانے دیتے تھے۔

اسی طرح شمالی عرب کا کچھ حصّہ رومی عیسائیوں کے زیرنگین تھا۔ ان کا سلوک بھی عربوں کے ساتھ برابر کا نہ تھا۔ اس کے علاوہ خود عرب کے مختلف گھرانوں میں لڑائی ٹھنی رہتی۔ اور جو فرقہ اموال و افراد کی بہتات رکھتا۔ وہ دوسروں پر قابو پالیتا۔ اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے دیتا تھا۔ فرقہ کا سردار سرمایہ۔ زمین اور مال مویشی کی وجہ سے باقی لوگوں کو اپنے زیر اقتدار کرلیتا۔ اور انہیں جس راہ پر چاہتا چلاتا تھا۔ حقوق نسواں کو بھی اس تحریک حریت و مساوات سے بڑا گہرا تعلق ہے اس زمانہ میں عرب عورتوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ ان کو مردوں کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا۔ باپ کے مرنے پر بیٹا اسکی تمام بیوگان کا مالک سمجھا جاتا۔ اور ان سے جیسا سلوک چاہتا کرتا۔ اور جس طرح کی خدمت چاہتا لیتا۔ جس شخص کے پاس روپیہ زیادہ ہوتا۔ وہ اسے سود پر لگاتا اور غریبوں کا خون چوس چوس کر پیتا۔ اسوقت عرب کے یہودی بڑے زردار تھے۔ انہوں نے عربوں کا کچھو مر نکال رکھا اور انکو سود در سود کی پیچ در پیچ الجھنوں میں پھنسا رکھا تھا۔ اس اخلاقی انحطاط زر پرستی جبر و استبداد اور عدم مساوات کے دور میں حضرت محمدؐ معبوث ہوئے۔ اور انہوں نے سارے عرب میں حریت و مساوات عدل و انصاف کا روح پرور اعلان کیا۔ اور ان تمام راہوں کو بہت بڑی حد تک بند کردیا جن سے امیروں کو غریبوں پر ہاتھ صاف کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔

تحریک سوشل ازم اقتصادی اور سیاسی دونو پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس

تحریک کا منشاء یہ ہے کہ وسائل پیداوار یعنی زر اور زمین کے ساتھ حکومت بھی فرد کے ہاتھ سے نکل کر قوم کے ہاتھ میں چلی جائے۔ اِس حقیقت کو مختلف اشخاص نے مختلف الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ چنانچہ آزاد خیال لوگوں کی رائیں ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہیں۔

ای وندڑ ولڈ[1]۔ سوشل ازم سے مراد ہے تنظیم مزدور کے بل پر سیاسی قوت کا حاصل ہونا۔ تاکہ سرمایہ دار کی جایداد سوسائٹی کی جایداد بن جائے۔

فلپ سنوڈن[2]۔ سوشلسٹ تنظیم میں شامل ہے۔ اِس پیدا اور تقسیم ہونے والے سرمایہ کی مجموعی ملکیت جو سوسائٹی کے کاروبار میں برتا جاتا ہے۔ سوسائٹی کے اِس کاروبار کا انتظام بہترین اشخاص کے ہاتھ میں رہے۔ اور یہ لوگ خود قوم کے آئین اقتدار کے تحت کام کریں۔

سڈنی وب[3]۔ سوشل ازم کے بنیادی اصول یہ ہیں (الف) شخصی مفاد کو مجموعی سے بدل دینا۔ (ب) کرایہ اور سود کو شخصی مفاد کی بجائے مجموعی کی خاطر کام میں لانا۔ اِس ارتقائی تغیر کے ذرائع مجموعی ملکیت۔ مجموعی انتظام۔ مجموعی ٹیکس اور مجموعی رسد رسانی ہیں۔ یہ سب باتیں اقتصادی اور سیاسی جمہوریت کے ماتحت ہونی چاہئیں ؎

---

[1] E. Vandervelde
[2] Philip Snowden
[3] Sidney Webb

میکس بیر[1] - سوشل ازم سے مراد ہے پبلک پیداوار کے ذرائع کا انتظام پبلک کی معرفت[2] ان آرا سے منکشف ہوتا ہے کہ سوشلسٹ تحریک اصل میں اقتصادی اور سیاسی وجوہ پر جماعت اور فرد کے مابین ایک خاص طرح کی رقابت ہے۔ فرد جماعت کے مصالح کو پس پشت ڈال کر ذاتی مفاد کا جویاں ہے جماعت شخصی مفاد کو ٹھکرا کر نوعی مفاد کی متلاشی ہے۔ یہ مفاد دو طرح کا ہوتا ہے اقتصادی اور سیاسی۔ اقتصادی مفاد یہ ہے کہ ذرائع پیداوار یعنی سرمایہ زمین۔ اور زراعت فرد کے ہاتھ سے نکل کر جماعت کے ہاتھ میں چلے جائیں اور زمین اور سرمایہ کی پیداوار جماعت کے ذریعہ حاصل ہو۔ اور جماعت کے ذریعہ ہی تقسیم ہو۔ سیاسی مفاد یہ ہے کہ حکومت شخصی کو جمہوری اور آئینی کی شکل میں بدل دیا جائے۔ تاکہ جماعت خود اپنے حقوق و مصالح کی نگراں رہے۔ اس تحریک کا نقطہ نگاہ افادی[3] ہے۔ یعنی کثیر ترین اشخاص کی اشد ترین خوشی اور بہتری۔

رومن قوم جو قریباً آٹھ سو سال تک عروج پر رہی۔ جس وقت گری۔ اُسکے اندر زوال کے تمام اسباب کم و بیش پیدا ہو چلے تھے۔ وہ تن آسانی کی طرف جھک گئی تھی۔ اُسے اچھے اچھے کھانے پینوں کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اُسے فنون لطیفہ

---

[1] Max Beer [2] دیکھو سوشلسٹ موومنٹ از آرتھر شیڈ ویل حصہ اول۔ ص ۱۳۰ تا ۱۴۰ [3] Utilitarianism

میں فنا کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ اُس کی فوجی روح مٹ چکی تھی۔ اس کا عسکری نظام ملیامیٹ ہو چکا تھا۔ ساری قوم سے معدلت و مساوات کا ملکہ کافور ہوگیا تھا۔ دوسری قوموں کے ساتھ اس کا سلوک غلامانہ تھا۔ انکے اندر امیروں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی تھی۔ جس کا غریب جماعت کے ساتھ سلوک قابل نفرین تھا امیر لوگ مزدور اور محنتی جماعت کی گاڑھی کمائی چٹ کر جاتے اور کھانے پینے پہننے اور رہنے سہنے سب باتوں میں تعیش کا لطف اٹھاتے۔ اور غریب طبقہ بمشکل اپنا پیٹ پال سکتا۔ اور تن ڈھاک سکتا تھا۔ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ رومی سلطنت کا زوال شاہ اگسٹس[1] کے عہد سے شروع ہوا۔ اس نے جہاں اور سیاسی غلطیاں کیں۔ وہاں ایک غلطی یہ بھی کی۔ کہ جمہوریت کو بدل کر خود مختاری کی بنیاد ڈالی۔ اور ہمیشہ کے لئے سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ مگر ساتھ ہی اس نے اس وقت اٹلی کے لوگوں کے آنسو بھی پونچھ دیئے۔ کیونکہ اس سے ان لوگوں کا اقتدار بھی مٹ گیا۔ جن کے ہاتھوں عوام نالاں تھے لیکن اس طرز حکومت سے سینٹ[2] کی قوت کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ پرنس آف سینٹ[3] کا عہدہ قابل اور معزز ترین شہری کو چناؤ سے ملتا تھا۔ سیزر نے کوشش کر کے یہ عہدہ اپنے لئے منظور کرا لیا۔ اور آئینی حکومت کے نازک جسم کو اس طرح مہلک زخم لگایا۔

۱؎ Augustus ۲؎ Senate ۳؎ Prince of Senate

اِس آئینی تغیر سے بادشاہ کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہو گیا۔ وہ خود سٹیٹ پر حکومت کرتا۔ خود سرکاری خزانے کا روپیہ خرچ کرتا۔ خود جنگ یا امن کا اعلان کرتا۔ خود عہدناموں کی تصدیق کرتا۔ اعزازات سرکاری کے لئے اپنی مرضی سے امیدوار چنتا۔ اپنی جماعت کے آدمیوں کو طرح طرح کے انعام و اکرام سے مالامال کرتا۔ اپنے نقطۂ نگاہ سے اپنے ملک کے لئے جو اچھا سمجھتا بلا تامل کئے جاتا۔ اور اپنی ذات کو تمام قوانین کی گرفت سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں جرنیلوں کو حد سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ وہ سپاہیوں۔ دشمنوں اور مفتوحہ ملکوں کے لوگوں کے مال و جان کے مالک ہوتے اور ان سے جو چاہتے کرتے تھے۔ جو جرنیل کسی مہم پر بھیجا جاتا۔ اُسے دشمن کی گوشمالی کا ہر طرح سے اختیار ہوتا تھا۔ مفتوحہ ممالک کے والیوں کو وہ معزول کر سکتا تھا۔ ان کی سلطنت ضبط کر کے ان کا ملکی خزانہ اپنی فوجوں میں بانٹ سکتا تھا۔ جب کوئی جرنیل اس طرح مفتوحہ ملک میں سکہ بٹھا کر دارالخلافہ واپس آتا تو سینٹ کے ممبر جھٹ ایک اجلاس بلا کر اس کی تمام کارروائیات پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے تھے اس بادشاہ نے جہاں ایک طرف یہ خرابیاں پیدا کیں۔ وہاں ایک نئی اُپج یہ بھی لی۔ کہ دارالخلافہ کے اندر قیصر وقت کے لئے ایک فوجی گارد کا تقرر کر دیا۔

ملہ ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر۔ جلد اول۔ ص ۶۰ تا ۶۴۔

اِس گارد کا کام یہ ہوتا تھا۔ کہ جس طرح سے بن پڑے عامۃ الناس اور سینٹ کے ممبروں کا گلا دبا کر بادشاہ وقت کے احکام کی تعمیل کرائی جائے۔ رفتہ رفتہ اِس گارد کا اقتدار اِس قدر بڑھ گیا۔ کہ خود بادشاہ اور ارکان حکومت اِس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ ایک وقت سینٹ کی حکومت۔ بادشاہ کا تقرر، سرکاری خزانہ اور دار الخلافہ سب کچھ اِس گارد کے ہاتھ میں تھے۔ تمام بڑے بڑے عہدہ داروں کے تقرر میں اِس گارد کو بڑا دخل تھا۔ اس نے پبلک اور حکومت کے تمام اختیارات چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ اِسے پریٹورین[1] گارد کہتے تھے۔ اِسی گارد نے اپنے اقتدار کے جنون میں بادشاہ وقت پرٹنیکس[2] کو قتل کر کے کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ کہ سلطنت نیلام عام کے ذریعہ بیچی جائے گی۔ چنانچہ ڈڈیس جولینس[3] کو نیلام عام کے ذریعہ بادشاہ بنایا گیا۔ اِس کی اِس زبون حرکت سے ساری سلطنت کے اندر غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ برٹن۔ شام اور دوسرے ملکوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اِن تمام باتوں کا نچوڑ یہ ہے۔ کہ آگسٹس نے ملک کی اقتصادی اور مالی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا۔ اور آئینی حکومت کو شخصی سے بدل دیا جس سے

۱۔ Praetorian Guard ۲۔ Pertinax

۳۔ Diduis Julianus

جس سے سلطنت کو بڑا دھکا لگا اور ایسا لگا کہ پھر رومی قوم کبھی سنبھلنے سے نہ سنبھل سکی مسٹر گبن اپنی کتاب زوال وانحطاط رومتہ الکبریٰ میں اس سلطنت کے زوال کے اسباب پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔ "روما کے زوال کی وجہ اسکی حد سے بڑھی ہوئی شان وشوکت تھی۔ خوشحالی نے گراوٹ کے اصول کو پختہ کر دیا تھا۔ تباہی کے اسباب وسعت فتوحات کے ساتھ ساتھ بڑھتے رہے۔ اور جونہی کہ زمانہ نے اسکے مصنوعی ستون ہٹائے یہ ساری سر بفلک عمارت اپنے ہی بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ سلطنت کی عظمت فوج کی ہی بدولت تھی۔ اور اس کی تباہی بھی فوج کے ہی ہاتھوں ہوئی۔ فاتح فوج نے دور دور فتوحات کا سلسلہ پھیلا کر ملک ملک کی برائیوں اور بدیوں کا اکتساب کیا۔ اپنی جہالت و بربیت سے ارکان حکومت کو تنگ کرنا شروع کیا۔ اور آخر ایک وقت بادشاہ کی عزت واحترام کو بھی خاک میں ملا دیا۔ شاہانِ وقت کو فوج کے اِس تطاول وتعدی کیوجہ سے اپنی جان اور پبلک امن امان کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اِس لئے انہوں نے اِس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کے لئے یہ پیچ مارا۔ کہ فوجی ربط وضبط مٹا کر قوم کی فوجی ذہینت ہی بگاڑ دی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربر اقوام نے رومیوں پر غالب آکر آہستہ آہستہ رومی سلطنت کو ملیا میٹ کر دیا[1]۔" رومی قوم کی تاریخ عروج ونزول کے پانچوں اصولوں کا ایک ایسا عملی سبق

---

[1] ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر از گبن جلد اول ص ۵۵ تا ۹۳۔ جلد دوم ص ۵۷۶ و ۵۷۷۔

ہے۔ کہ اسکی نظیر اور کہیں مشکل سے ملیگی۔ موزخوں نے تاریخ روما کے پانچ دور قرار دیئے ہیں۔

اوّل۔ ۷۵۳ ق م سے ۵۱۰ ق م تک۔ ایک چھوٹی سی شاہی سلطنت۔

دوئم۔ ۵۱۰ ق م سے ۲۷۰ ق م تک۔ جمہوریت کا قیام اور پیٹرز اور پلیبیز کے رقابتی معرکے۔

سوئم۔ ۲۷۰ ق م سے ۱۳۳ ق م تک۔ فتوحات اور سینیٹ کی حکومت۔

چہارم۔ ۱۳۳ ق م سے ۲۳ ق م تک نظام حکومت کی شکستگی اور جرنیلوں کا اقتدار۔

پنجم۔ ۲۳ ق م سے ۴۱۰ء تک شہنشاہیت عیش وعشرت اور زوال

ان پانچوں دوروں کا پھیلاؤ کوئی ہزار سال تک نکل جاتا ہے۔ گو ہمارا منصب تاریخی واقعات کا من وعن دہرانا نہیں۔ لیکن اُن پر اختصار سے انتقادی نگاہ ڈالنا بھی بجائے خود ایک نئی تاریخ لکھ ڈالنا ہے۔ اور یہ کام بھی اس وقت ہمارے بس کا نہیں۔ اس لئے اِس کتاب میں قوموں کے جستہ جستہ واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رُوما کی ابتدائی حکومت ایک چھوٹی سی مطلق العنان سلطنت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس حکومت کا آخری تاجدار ٹارکوئن[1] بڑا سفاک اور بڑا احمق تھا۔

---

[1] Tarquin

اِس کی ناشائستہ حرکات سے لوگوں کا پیمانۂ صبر جب لبریز ہوا۔ تو اس کو تخت سے اُتار دیس نکالا دیا گیا۔ اور جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ واقعہ ۵۱۰ء کا ہے اس کے بعد یہ قوم پھلتی پھولتی رہی۔ اور اُس کا یہ عروج اس وقت تک رہا جبتک کہ نظامِ حکومت جمہوری رہا۔ اِس عہد پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اِس چار پانسو سال کے عرصہ میں قوم کی عنان توجہ ذیل کی باتوں پر مبذول رہی۔ (الف) قومی اخلاق کا سنوارنا۔ عقلانی ذہنیت کا بلند کرنا۔ اور زندگی کا سدھارنا۔ (ب) مساوات و حریت کے اصول کا آہستہ آہستہ اعلےٰ پیمانے پر آنا (ج) فوجی ملکہ کا قائم رکھنا اور (د) علوم و فنون مفیدہ کی اشاعت کرنا۔ یہ باتیں اسوقت تک رہیں جب تک کہ رومیوں کا نظام حکومت جمہوری رہا۔ اور جب اِس نظام میں فرق آنے لگا تو پھر اوپر کی چار باتوں میں بھی اُن کا زاویہ نگاہ بدلنا شروع ہوا یہ دوسرا اور تیسرا دو نو دور ۵۱۰ء قام سے ۱۳۳ء قام تک چلے جاتے ہیں۔ گویا کہ یہ عہد رومیوں کے عروج کا سُنہری زمانہ ہے۔ اِس کے بعد ۱۳۳ء قام سے ۲۳ء قام تک کا زمانہ اِس قوم کے تدریجی زوال کا ہے۔ یہ عہد نظام حکومت کے بگڑنے ۔ شہنشاہیت کے زور پکڑنے۔ علوم و فنون لطیفہ کے بڑھ نکلنے۔ مساوات کے مٹ جانے اور قومی اخلاق کے کمزور ہونے کا ہے۔ پانچواں دور ۲۳ء قام سے ۴۱۴ء تک کا اِس قوم کی تباہی اور بربادی کا ہے۔ اِن پانچوں دوروں کی اپنی اپنی خصوصیتیں ہیں جن سے قوم کی اندرونی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا دور عدم مساوات کا تھا۔

جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا دوسرا اصول دور مساوات کے زور پکڑنے کا تھا۔ اس دور میں امرا
وغربا کے رقابتی معرکے ہوتے رہے اور آخر مساوات کا پلڑا ہی بھاری رہا۔ اور
عدل وانصاف اور مساوات وحریت نے قوم کے پاؤں چومے۔ تیسرا دور بھی
قوم کے عروج کا تھا۔ چوتھا دور عروج وانحطاط کے آمیختہ اسباب کا تھا۔
پانچواں دور جو ۲۳ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ قوم کے خالص زوال وانحطاط
کا تھا۔ اس عہد میں جو بادشاہ گذرے وہ اکثر اپنی اندر اور باہر کی رعایا کو بھیڑ
بکریاں سمجھتے رہے۔ بلکہ شہنشاہ آگسٹس[1] کے بعد جس قدر بھی ہوئے۔ وہ قریباً
سارے کے سارے مساوات وحریت کے دشمن۔ بڑے ظالم وسفاک اور بڑے
قوم کش تھے۔ آگسٹس کے بعد ٹبرایس[2] کا سارا وقت سازشوں کے جوڑ توڑ میں
گذرا۔ اس نے اپنے دشمنوں اور درباریوں کو دل کھول کر لوٹا۔ ذلیل کیا۔ اور
موت کے گھاٹ اتارا۔ اور خود جی بھر کے عیش وعشرت کی۔ اس کی موت بجائے خود
ایک راز سربستہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے عہد میں صیغہ مخبری کو بہت ترقی ہوئی
اور یہ بدیہی بات ہے کہ جو بادشاہ کمزور۔ کم ظرف۔ کم عقل اور بدچلن ہو۔ اسکو اپنے
بچاؤ کے لئے زیادہ تر خفیہ محکمہ خبر رسانی کا رکھنا پڑتا ہے[3]۔ بعینہ یہی صورت

---

[1] اس کا عہد حکومت ۱۴ء کو ختم ہوا۔ [2] Tiberius

[3] معمولی محکمہ خفیہ رسانی رکھنا ہر ایک حکومت کے لئے ازبس ضروری ہے جیسا کہ آجکل رکھا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہاں حد سے گذرنے کا ہے۔

اس بادشاہ کے عہد میں ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کی سیاسی قوت بالکل کمزور ہوگئی۔ اور مطلق العنانی کا زور ہوا۔ لوگوں میں نفاق ڈال کر اور اُن میں بے اعتباری۔ بے اعتمادی اور تفرقہ پیدا کرکے اور اُن کو سیاسی طور بالکل کمزور کرکے حکومت کرنا قوم کا شیوہ ہوگیا۔ دوسری قوموں سے بھی اُن کا سلوک نہایت ناپسندیدہ تھا۔ اُن کے اپنے گھر کے اندر حریت ومساوات کی وہ گت ہو رہی اور جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی۔ کہ پناہ بخدا۔ اب وہ دوسروں کو کیونکر پینے دیتے تھے اس بادشاہ کے آخری ایام حکومت میں تحریر وتقریر کی آزادی بھی جاتی رہی تھی اس کے بعد کیس بادشاہ ہوا۔ یہ تخت پر بیٹھتے ہی عیش وعشرت میں پڑگیا۔ اور علانیہ جلسوں میں گانے اور ناچنے لگا۔ چونکہ اس نے سارا خزانہ بدچلنیوں اور فضول خرچیوں میں اڑا دیا تھا۔ اس لئے اُسے روپیہ اینٹھنے کی یہ تدبیر سوجھی کہ دولتمند اشخاص پر کچھ نہ کچھ الزام لگا کر اُنہیں مروا ڈالتا۔ اور اُن کی دولت خود سنبھال لیتا۔ اس نے ماتحت علاقوں کے شہزادے اپنے گرد جمع کر رکھے تھے۔ ان کی خوشامدوں سے اس کا دماغ آسمان پر پہونچ گیا تھا اور ایک وقت اُس نے یہ دعویٰ بھی کردیا تھا۔ کہ وہ خود دیوتا ہے۔ اور کہ اسکی پرستش تمام دنیا کی پرستشوں سے بہتر وبرتر ہے۔ اپنی رعایا کے ساتھ اُس نے جو استبداد اور عدم مساوات کا طریق اختیار کر رکھا تھا۔ اس کا انجام کار یہ ہوا کہ وہ قتل کردیا گیا۔ اسکے بعد ۴۱ء میں کلاڈیس بادشاہ بنا۔ وہ اپنی بیوی کے ہاتھوں زہر سے ہلاک ہوا۔ اسکے بعد

نیرو بادشاہ ہوا۔ یہ بڑا سفاک اپنے وقت کا ضحاک تھا۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو ابھی خورد سال ہی تھا۔ زہر دیکر مروادیا۔ اور اپنی والدہ پر بھی قاتلانہ حملے کروائے۔ اور آخر اُسے بھی ٹھکانے لگا کے دم لیا۔ اس نے اپنے کئی درباری اور رشتہ دار جان سے مروا ڈالے۔ اپنی بیوی کو بھی لات مارکر اس کا دھندا چلتا کیا۔ غرضیکہ اُس نے دل کھول کر قومی مساوات و حریت کی مٹی پلید کی۔ وہ خود بھی کیفر کردار کو پہونچا۔ اور خودکشی کر کے دُنیا کے عذاب سے چھوٹا۔ اِسکے بعد جو بادشاہ ہوتے رہے اُن میں سے اکثر یا تو خودکشی کرتے رہے۔ یا مارے جاتے رہے۔ اور داغ ناکامی ساتھ لے جاتے رہے۔ امیر؎

ہر اک دِل پہ ہیں داغ ناکامیوں کے
نشاں دے گیا بے نشاں کیسے کیسے

اِن کے عہد حکومت میں بھی آزادی و حرّیت کا خاکہ اڑایا جاتا رہا۔ اور معدلت و مساوات کا بدترین سیاہہ دکھایا جاتا رہا۔

مہابھارت کا مشہور عالم یدھ بھی اصل میں عدم مساوات کا یدھ تھا۔ اِس میں چونکہ مساوات کے اصول کو کچل دیا گیا تھا۔ اور مساوات ہے ہر سچے مذہب کا بنیادی اصول اِس لئے یہ یدھ تاریخ ہند میں دھرم یدھ کہلاتا ہے۔ ہستنا پور کے راجہ شانتنو کے دو بیٹے بھیشم اور وچترویریہ تھے۔ بھیشم بڑا تھا لیکن اُسنے اپنی سوتیلی ماں کے کہنے پر راج پاٹ نہ کرنے کا عہد کرلیا تھا۔ اس لئے راج چھوٹے

بھائی وچترویریہ کو ملا۔ وچترویریہ کے دو بیٹے دھرت راشٹر اور پانڈو تھے۔ بڑا دھرت راشٹر مادرزاد اندھا تھا۔ اس لئے پانڈو ہستناپور کے تخت کا وارث بنا۔ پانڈو کے ہاں پانچ بیٹے ہوئے۔ یدھشٹر۔ بھیم۔ ارجن۔ نکل اور سہدیو۔ پانڈو کے مرنے پر چونکہ یہ پانچوں کم سن تھے۔ اس لئے دھرت راشٹر اپنے چچا بھیشم کی مدد سے راج پاٹ کرنے لگا۔ دھرت راشٹر نے یدھشٹر کو رواج کے مطابق اپنا ولیعہد بنایا۔ اس پر دھرت راشٹر کے بیٹے دریودھن اور اس کے بھائیوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور یہ آگ دیر تک سلگتی رہی حتیٰ کہ دریودھن اور اسکے بھائیوں نے اپنے اندھے باپ کی چشم بصیرت میں خاک ڈالی۔ اور اس سے اندھا دھند پانڈوں کی جلاوطنی کا حکم جاری کرایا۔ خدا بھی مظلوموں کی خوب سنتا اور انکے انتقام کی راہ نکالتا ہے۔ پانڈوں کی قسمت دیکھئے کہ انہیں دنوں پنچال کے راجہ دروپد کی لڑکی دروپدی کی رسم سوئمبر رچی۔ اس میں پانڈو بھی جا شامل ہوئے ایک اونچے ستون کے سرے پر ایک چکر گھوم رہا تھا۔ اور اس چکر کے بیچ میں ایک مچھلی سونے کی لگی تھی۔ شرط یہ تھی کہ جو اس مچھلی کی آنکھ میں تیر لگائے۔ اسکے گلے میں مالا ڈالدی جائے گی۔ راجاؤں مہاراجاؤں سب نے دانشمندی کے تیر چلائے۔ مگر سب کے خالی گئے۔ آخر ارجن نے ایک تیر ایسا تاک کر مارا کہ مچھلی کی آنکھ چھد گئی۔ ساری مجلس سے واہ واہ کا غل اٹھا اور جے مالا ارجن کے گلے میں ڈالدی گئی۔ اور اسکے ساتھ دروپدی کی شادی بڑی دھوم دھام سے

کر دیگئی۔ راجہ پنچال کی شہ سے ارجن اور اُسکے بھائی دھرت راشٹر سے آدھا راج لینے میں کامیاب ہوئے۔ مگر جب پانڈوں نے موجودہ دہلی کے پاس شہر اندر پرست بسا کر کچھ اور علاقے بھی ساتھ ملا لیے۔ تو دریودھن کے سینے میں حسد کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اور اُسے پانڈوں کو تنگ کرنے کی نئی سوجھی۔ یدھشٹر کو جوا کی لت پڑ گئی تھی۔ اس لیے دریودھن نے اُسکے ساتھ بازی جوئے کی لگائی۔ اور ایسا داؤں کھیلا۔ کہ یدھشٹر کا راج پاٹ اور دروپدی بھی جیت لی۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ یدھشٹر معہ اپنے بھائیوں کے بارہ۱۲ سال جلا وطن رہے۔ جب یہ عرصہ گذر گیا تو پانڈوں نے کوروں کو کہلا بھیجا کہ ہمارا راج ہمیں واپس کر دیجئے۔ دریودھن نے ٹکہ سا جواب دیا۔ اس پر طرفین میں لڑائی ٹھن گئی۔ اور تھانیسر کے میدان میں وہ یدھ ہوا کہ ہند عتیق کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ اس میں سارے ہند کے راجے مہاراجے شامل ہوئے۔ اور برابر اٹھارہ دن تک میدان کارزار گرم رہا۔ اس لڑائی میں وہ آگ برسی کہ الحفیظ۔ دریودھن جو کورو خاندان کی ناک تھا۔ کٹ کر خاک میں گر پڑا۔ اور اُسکے ساتھ سارا خاندان کھیت ہوا۔ یہ یدھ انصاف اور بے انصافی یعنی حق و باطل کا تھا۔ کورو جھوٹ پر تھے اور پانڈو راستی پر۔ اور چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اس لئے اس میں کوروں کا ہی ستھراؤ ہوا۔ اس لڑائی میں سری کرشن جی پانڈوں کے ساتھ تھے۔ گیتا کا اپدیش جو وحدت وجودی و شہودی کا ایک دفتر بے پایاں سمجھا جاتا ہے۔ آپ ہی کا ہے۔

جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ اور ارجن نے اپنے بزرگوں۔ بھائیوں اور رشتہ داروں کو مقابل کی صفوں میں دیکھا۔ تو وہ لڑنے سے جی چرانے۔ اور سری کرشن جی سے کہنے لگا۔ کہ میں نے اس راج سے کیا لینا ہے۔ جس کے لئے مجھے اپنے بزرگ تہ تیغ کرنے پڑیں۔ اس وقت سری کرشن جی نے یہ اُپدیش دیا۔ جسکا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مرنے سے کوئی نہیں مرتا۔ کیونکہ آتما ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز ہے اسے تلوار کاٹ سکتی ہے نہ آگ جلا سکتی ہے۔ اس یدھ کو ایک قول کے مطابق قریباً پانچ ہزار سال اور ایک کے مطابق ساڑھے تین ہزار سال ہوئے ہیں لیکن دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ بے انصافی اور عدم مساوات کس طرح قوموں کو تہ و بالا کرتی اور انہیں کیا کیا کنوئیں جھکاتی ہے۔ اگر کورو عقل سے کورے نہ ہوتے تو وہ اس طرح طمع میں پھنس کر جنگ کے دیوتا کی بھینٹ نہ چڑھتے اور آنے والی نسلوں کے لئے سرمایۂ عبرت نہ بنتے۔ امیر ؎

زمانہ بھر میں ہے مشہور حال اخوانِ یوسف کا
طمع دنیا کی وہ ہے جس سے بازو ٹوٹ جاتے ہیں

رامائن کی کتھا بھی اصل میں بے انصافی کی ایک کتھا ہے۔ کوشل خاندان میں وشسٹھ ایک نامی راجہ ہوئے ہیں۔ انکی تین رانیاں تھیں۔ کوشلیا سومترا کیکئی کوشلیا کے بطن سے رام چندر تھے۔ جو سب سے بڑے تھے۔ سومترا کے بطن سے لچھمن اور شترگھن تھے۔ اور کیکئی کے بطن سے بھرت۔ راجہ وشسٹھ رام چندر

کو ولیعہد بنایا چاہتے تھے۔ اس پر رانی کیکئی سخت تلملائی۔ وہ دل سے چاہتی تھی۔ کہ راج بھرت کو مل جائے۔ راجہ نے کیکئی کو دو باتیں پوری کرنے کا بچن دیا تھا۔ کیکئی کو یہ موقعہ خوب ہاتھ آیا۔ اُس نے راجہ سے کہا کہ اپنا وعدہ پورا کیجئے۔ راجہ نے پوچھا کہ کیا چاہتی ہے۔ وہ بولی کہ ایک تو یہ کہ رام چندر جی کو چودہ برس کا بن باس ملے۔ اور دوسرے یہ کہ بھرت کو تخت و تاج ملے۔ راجہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور طائر روح عذاب کے پنجرے میں گرفتار ہوا۔ راجہ دن بدن اسی غم میں گھلے اور گھٹے جاتے تھے۔ رام چندر جی تو تھے اپنے باپ کی آنکھوں کے تارے۔ باپ ان پر فدا تھا۔ اور یہ باپ پر نثار تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر باپ کا بچن پورا نہ ہوا۔ تو پھر یہ اُن کے لئے دین و دنیا کا ٹوٹا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے۔ کہ سورج بنسی خاندان کا آفتاب جو اب گھٹا جا رہا ہے۔ جلد ہی غروب ہو جائے گا۔ اور ساری دنیا آنکھوں تلے اندھیر ہو گی۔ پس رام چندر جی نے جو حقیقتہً سارے خاندان کے پیارے اور ساری قوم کی آنکھوں کے تارے تھے۔ بن باس قبول کی۔ اور اس طرح خاندان کوشل کا چاند سیتا اور لچھمن دونوں ستاروں سمیت جنگلوں میں چھپ گیا۔ بھرت اُن دنوں ننھال گئے ہوئے تھے وہ تو دانش و بینش سے بھرپور تھے۔ گھر واپس آئے تو ماتا کی اس حرکت پر یکطرف سخت جلے بھنے اور دوسری طرف فرط ندامت سے پانی پانی ہوئے۔ راجہ دشرتھ تو آگے سدھار چکے تھے۔ بڑے بڑے درباریوں کو ساتھ لے کر سری رام چندر جی کے

پیچھے گئے۔ اور انہیں واپس لانے کے لئے لاکھ جتن کئے۔ مگر وہ نہ آئے۔ آخر مایوس ہوکر واپس آئے اور انکی کھڑاویں تخت پر رکھدیں۔ اور خود نائب کی حیثیت میں کاروبار سلطنت چلانے لگے۔ یہاں بن میں رام چندر جی پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ایک روز لنکا کے راجہ راون کی بہن سروپ نکھا اُن کے پاس آئی۔ اور انکی جوانی و حُسن پر لٹو ہو گئی۔ اور اُن پر شادی کے لئے ڈورے ڈالنے لگی۔ رام چندر جی نے صاف انکار کر دیا۔ جب اس نے اصرار کیا۔ اور رام چندر جی کو اور کوئی صورت چھٹکارہ کی نظر نہ آئی۔ تو آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ اُس کے ناک کان کاٹ لئے۔ راون اپنی بہن کی ناک کٹی دیکھ کر دل ہی دل میں کٹ کر رہ گیا۔ اور خیال کرنے لگا کہ اُس کے سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ اب ادلے کا بدلہ یہ ہے کہ رام چندر جی کی آبرو پر ہاتھ ڈالا جائے۔ چنانچہ اِس خیال سے وہ سیتا جی کو جو سارے کوشل خاندان کی عزت و آبرو تھی۔ اڑا لے گیا۔ اور اپنی ساری عمر کی گاڑھی کمائی اور بھگتی پر پانی پھر گیا۔ جب رام چندر جی کو راون کی اِس حرکت کا پتہ چلا تو آپ نے لنکا پر چڑھائی کر دی۔ اس یدھ میں راجہ سگریو نے سری رام چندر جی کا ساتھ دیا اور راون مارا گیا۔ دسہرہ کے دن راون کے گیارہ سر دکھائے جاتے ہیں۔ دس سر تو اس کے علم و دانش کے ہیں۔ اور ایک سر گدھے کا جو سب سے اونچا نکلا ہوتا ہے۔ خدا کی شان! اُس کے دانشمندی کے دس سر تو اُسکے کسی کام نہ آئے۔ اور اُسے اُسکا گدھا پن لے ڈوبا۔ آخر بن باس کا عرصہ

ختم ہونے پر رام چندر جی معہ لچھمن اور سیتا کے اجدھیا واپس آئے۔ لوگوں نے خاندان کوشل کے اس چشم و چراغ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں۔ اور اُس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کر کے گھر گھر چراغ جلائے۔ دیوالی کا تیوہار اسی دن کی یادگار ہے۔ بھرت نے خوشی خوشی راج پاٹ اپنے بڑے بھائی کے حوالہ کیا۔ اور خود انکی فرمانبرداری کا دم بھرنے لگے۔ یہ سارا واقعہ اپنے اندر بہت سی سبق آموز باتیں لئے ہوئے ہے۔ کیکئی کی بے انصافی لچھمن اور سیتا کی جانفشانی۔ بھرت کی انصاف پسندی اور آئین نوازی۔ راون کی خر دماغی اور بدسگالی۔ رام چندر کی جوانمردی۔ فرمانبرداری اور حقیقت طرازی۔ غرضیکہ وہ کون کونسی بات ہے جو رامائن کی اس پوتر کتھا میں چھپی موجود نہیں۔

یہ تو اگلے وقتوں کی باتیں ہوئیں۔ انہیں چھوڑیئے اور آج کی ہی سُن لیجئے۔ انقلاب فرانس کیوں ہوا؟ سرمایہ داروں کی زراندوزی اور غربا کے افلاس کی بدولت تاریخ فرانس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوئس شانز دہم کے زمانہ میں امیر طبقہ کا بہت زور ہو گیا تھا۔ اور عوام کے حقوق کی خبر گیری بہت کم ہوتی تھی۔ طبقہ امرا کو خاص خاص مراعات حاصل تھے۔ مچھلی پکڑنا۔ اور شکار کرنا صرف ان کا حق تھا۔ کاشتکار کو زمیندار سے زمین لینے سے پہلے کچھ نقدی ادا کرنا پڑتی۔ اور پھر تھوڑی سی پیداوار حق الخدمت کے طور پر لے کر باقی غلہ سارے کا سارا زمیندار کے حوالے کرنا ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ ہر ایک کاشتکار کو مالک کے پاس ہر سال کچھ دن

مفت کام کرنا پڑتا تھا۔ کاشتکار زمین کی کاشت بھی اُسی طرح کرسکتا تھا جس طرح کہ مالک ہدایت کرتا۔ ٹیکس بھی حد سے زیادہ تھے۔ امیر طبقہ اس سے بھی مستثنےٰ تھا۔ پرمٹ اور چونگی سے اشیاءِ خوردنی و پوشیدنی کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ وصولی محصول کا طریق ایسا تکلیف دہ تھا کہ جو مال ایک جگہ سے دوسری جگہ دنوں میں لے جایا جاتا۔ وہ اب مہینوں میں بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اسکے علاوہ صناع اور مزدور جو کھانے کی چیزیں اپنے ساتھ رکھتے۔ اُن پر بھی راستے میں محصول لگالیا جاتا کچھ علاقے اس ڈیوٹی اور محصول سے مستثنےٰ تھے۔ اور یہ وہی علاقے تھے جہاں امرا کا طبقہ رہتا تھا۔ مگر جہاں غریب مزدور رہتے وہاں بھاری محصول لگائے جاتے اور بہت زیادہ ٹیکس وصول کئے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شے ایک علاقے میں چند شلنگوں میں مل سکتی تھی۔ وہی دوسرے میں چند پونڈوں میں بھی میسر نہ آتی تھی۔

قریباً سارے فرانس میں نمک کی فروخت کا کام ایک خاص جماعت کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا۔ کوئی بھی کسی اور جگہ سے نمک نہ خرید سکتا تھا۔ اور سات سال سے زیادہ عمر کے ہر ایک شخص کو کچھ نہ کچھ نمک سالانہ خریدنا پڑتا تھا۔ نمک کی خرید میں اس قدر سختی برتی جاتی کہ اگر کسی کو شکار کی مچھلی بھوننا ہوتی یا گوشت میں نمک لگانا ہوتا تو وہ بھی مزید نمک خریدتا۔ اور پھر خرید کی تصدیق بھی حاصل کرتا۔

ہزاروں آدمی ہر سال عدم ادائیگی محصول اور قواعد کاشت کی خلاف ورزی پر جیلوں میں دھکیلے جاتے۔ بلکہ کبھی کبھی گلا گھونٹ کر مار بھی دیئے جاتے۔ ارا صنیات پر ایک

خاص قسم کا ٹیکس لگا ہوا تھا۔ جسے فرانسیسی میں "ٹیلی" کہتے تھے۔ اس سے زراعت کو تباہ کن نقصان پہنچا۔ یہ ٹیکس دو تہائی فرانس کی اراضیات مکانات اور دستکاری پر لگایا گیا تھا۔ اسکی ہر سال پھر سے تشخیص ہوتی۔ کسی بندھی ہوئی شرح تناسب سے نہیں بلکہ اور کرنے والوں کی خوشحالی کے تناسب سے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خوشحالی کی ذراسی نمایش پر ٹیکس بڑھا دیا جاتا۔ گورنمنٹ کی پالیسی اس قسم کی تھی کہ اس سے ہمیشہ قحط کی صورت نمودار رہتی۔ قحط زدہ علاقوں کے لئے سہولت اور امداد بہم پہنچانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ تعزیری قوانین کے بل بوتے پر لوگوں کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے آستین چڑھائے رہتی۔ مزدور پیشہ اشخاص پر خاص خاص پابندیاں عاید کی گئی تھیں۔ وہ خود بخود ایک جگہ کام چھوڑکر دوسری جگہ نہ جاسکتے تھے۔ اس طریق عمل سے فرانس کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بالکل بگڑ چکی تھی۔ دن بدن غریب طبقہ گرے جاتا اور امیر طبقہ ابھرے جاتا۔

ملک کی سیاسی حالت بھی بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ شاہ وقت عہدے بیچ کر روپیہ بٹورتا اور بلدیہ کے انتخاب کے حقوق کو بھی کئی ہاتھوں تھوڑی سی قیمت پر دے ڈالتا تھا اس طرح میونسپل اختیارات بھی امیر طبقہ کی ایک جماعت کے ہاتھ میں چلے گئے تھے۔ یہاں بھی عوام کے حقوق کچلے گئے۔ جب عامۃ الناس کا تعلق بلدیہ کے معاملات سے بھی منقطع ہوا تو پھر حکومت کو دست اندازی کا اور بھی موقعہ ملا۔ اس لئے محصول خزانہ اور نظم ونسق کے تمام معاملات میں میونسپلٹیاں وہی کرتیں جو امیر طبقہ اور حکام وقت

اُن سے کرانا چاہتے۔ اِس کا دیہاتی زندگی پر بہت بُرا اثر پڑا۔ بیچارے دہقانوں کو
کسی معاملے کے متعلق دیہات کے اندر اکٹھے ہو کر سوچ بچار کرنے کا اختیار نہ تھا۔
اور جب کبھی کسی معاملہ کے سلجھانے کی ضرورت پڑتی۔ تو وہ شہروں اور قصبوں میں
جا کر ارکانِ حکومت کے روبرو پیش ہوتے۔ اور اُن سے معاملات کا تصفیہ کراتے
اِس طرح عوام کے تمام معاملات پر چار و ناچار حکومت کے ہاتھ میں چلے گئے
تھے۔ اور چونکہ حکومت کے ارکان امیر طبقہ سے ہوتے تھے۔ اِس لئے طبقہ امرا
ہی عوام پر حکمرانی کرتا اور جس طرح بس چلتا غربا کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنی
زر اندوزی کا آلۂ کار بنائے رکھتا۔ اِن حالات کی وجہ سے فرانس کے لوگوں میں
بے اندازہ افتراق و تشتت رونما ہوا۔ طبقہ اعلےٰ۔ طبقہ اسفل۔ طبقہ متوسط۔ طبقہ
دیہاتی اور طبقہ شہری ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ ہو گئے اور جس کسی کا داؤں
چلتا۔ اپنے رقیب کی خوب خبر لیتا اور انتقام کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا
شرافت صرف پیدائشی حق خیال کیجانے لگی۔ اور تعلیم و تعلّم کا کام بھی ایک خاص
جماعت کا حق قرار دیا گیا۔ کوئی آدمی اپنی ذاتی قابلیت کے بل پر شرافت یا علم
کا امتیاز حاصل نہ کر سکتا تھا۔ بادشاہ وقت اِن خرابیوں کو جن کا اثر عوام پر پڑتا تھا۔
دور کر سکا نہ دور کرنے پر آمادہ ہوا۔ اِس ابتری نے ۱۷۸۹ء کے مشہور انقلاب
کی صورت اختیار کی اور حکومت امیر طبقہ کے ہاتھ سے نکل کر تمام رعایا کا ایک
مشترکہ حق قرار پائی اور حصول دولت کے تمام رسائل یعنی زر زمین اور محنت کے

باب ہیں ایسے قوانین نافذ ہوئے جن سے ترجیح بلا مرجح کی تمام خرابیاں مٹ گئیں اور ملک کے طول و عرض میں حریت و مساوات کی فضا پیدا ہوگئی [1]

فرانس نسوانی لطافتوں اور نزاکتوں کا گہوارہ جیسا جب تھا۔ ویسا اب ہے آب و ہوا کی لطافت۔ باغوں اور چمن زاروں کی روح افزا خنکی اور طراوت۔ ہری ہری گھاس اور اس کی بھینی بھینی بو باس۔ گھر گھر گلزار و گلشن۔ ماہ جبینوں اور لالہ رخوں کی نرچھی ادا۔ اور تیکھی چتون حسینوں کے پیپ شو [2]۔ انکے راتوں کو چھپ چھپ کے غمزے اور عشوے تازہ بتازہ نو بنو۔ امیر ؎

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

غرضیکہ جسم کی بالیدگی اور روح کی افسردگی کا کوئی سامان ایسا نہیں جو اس خطۂ بہشت میں موجود نہیں۔ یہاں کے ماہ وش ہیں تو چہرے کا رنگ شوخ۔ طبیعت شوخ۔ از سر تا پا شوخ۔ امیر ؎

معشوق وہ ہے جس کی طبیعت بھی شوخ ہو
کیا فائدہ فقط ہو چہرے کا رنگ شوخ

---

[1] Burke's Reflections on the French Revolution

[2] Peep-show by E. G. Selby p 15 to 18

مے ہے تھے وہ بھی شوخی کی جان۔ یاقوتی کی کان ؎

ساقی شرابِ سرخ وہ مجھ مست کو پلا
یاقوت آبدار سے جس کا ہو رنگ شوخ

جام ہیں تو الگ پیمانہ خود سے پہلو مارتے اور اپنی گرمی سے اِن شوخ حسینوں کو اور بھی چمکا دیتے اور بڑوں بڑوں کو چکر میں لاتے ہیں۔ امیر ؎

خم بھرے شیشے کھلے دور میں ساغر آیا
چرخ کہتا ہے کہ لینا مجھے چکر آیا

جہاں ایک وقت اتنی شوخیاں جمع ہو جائیں۔ وہاں لوگوں کا بچ نکلنا اور کنارۂ سلامتی پر جا پہونچنا معلوم۔ امیر ؎

دریائے محبت سے جو پار اُتریں وہ جانیں
ہوتا ہے خدا جانے کہ ساحل نہیں ہوتا

اِس سرزمین کے لئے یہ کوئی نئی باتیں نہیں۔ جب تک جوانی کی امنگ اور مستی کی ترنگ موجود ہے۔ تب تک یہ سب چیزیں ہیں۔ اور جو جوانی گئی۔ تو پھر یہ سب چیزیں بھی گئیں۔ امیر ؎

ایک دل ہمدم میرے پہلو سے کیا جاتا رہا۔
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا
سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی

وہ اُمنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

پھر دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ کل کے اور آج کے فرانس میں فرق کیا ہے کسی وقت اِس ملک کے نظامِ سیاست میں اتنی الجھنیں پڑ گئی تھیں کہ اتنی کسی معشوق کے پیچ در پیچ گیسوؤں میں بھی نہ پڑی ہونگی۔ اور پھر الجھنیں بھی ایسی کہ ناخن تدبیر سے کھلنی محال نظر آتی تھیں۔ قوم کی آزادی، جنس لطیف کی عصمت، حکام کی دادگستری۔ ملک کی دولت۔ قوم کی عزت و عظمت سب شاہِ وقت کے رحم پر تھیں۔ اور پھر شاہ بھی ایسا کہ اس وقت دنیا بھر میں اس کے برابر کا کوئی رنگیلا نہ تھا۔ ہندوستان کا محمد شاہ رنگیلا شاید اس سے پہلو مارے تو مارے۔ مگر اور کوئی روئے زمین پر اس سے لگا نہ کھا سکتا تھا۔ اِس کی شوخیٔ طبع اور رنگینیٔ مزاج کے کیا کہنے۔ امیر؎

ہائے کیا دن تھے کہ دورِ بادہ پیما نہ تھا

بادشاہوں کا حلوخانہ درِ میخانہ تھا

قوم نے جب دیکھا کہ ایک طرف تو شاہ کا پیمانہ عیش نہیں پُر ہوتا اور دوسری طرف اُس کا اپنا پیمانہ حیات لبریز ہوتا ہے۔ تو پھر قوم کو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ یہ پیمانہ عیش ہی توڑ دیا جائے۔ اور ایسے بدمست کا کاسہ سر ہی پھوڑ دیا جائے۔ بس پھر کیا تھا دم بھر میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اور ساری محفل نشاط اکھڑ گئی۔ امیر؎

شب وصال وہ ساماں وہ روشنی وہ نشاط

ہوئی جو صبح تو اجڑا ہوا مکاں دیکھا

اب اگر کوئی کہدے کہ اُس وقت کے اور اس وقت کے فرائض ہیں اندھیرے اُجالے کا فرق کیوں ہے جبکہ معشوقوں کی آنکھیں اور آبروویں اور عاشقوں کے دل اور جگر جیسے جب تھے ویسے اب ہیں؟ امیر ؎

وہاں چشم وا بروہمنشیں اور یاں جگر ہے اس دل کے پاس

قاتل وہ قاتل کے قریں بسمل یہ ہے بسمل کے پاس

یہ سب بجا و درست چشم ما روشن دل ما شاد۔ حسینوں کے غمزے معشوقوں کے عشوے ان کی تیکھی چتون۔ انکی ترچھی ادا۔ انکی نرگسی آنکھیں۔ انکے گھنگھریالے بال۔ انکی آتشیں لب۔ مصحفی ؎

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو

مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

یاں لعل مسوں ساز نے باتوں میں لگایا

دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

یہ سب کچھ اب بھی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکے ایک بات اور بھی ہے جو پہلے نہ تھی یعنی کہ قوم نے نخل آزادی کی آبیاری کر کے اس سے پھل پھول بھی پیدا کر لئے ہیں اور تمام جوانانِ چمن اپنے رنگ میں کھینچ لئے ہیں۔ اِس لئے جن سیاہ زلفوں نے

ایک وقت عروس فرانس کے خوشنما چہرے کو گہنا دیا تھا۔ اب وہی اُسکے چہرے کو اور بھی زیادہ روشن کر رہی ہیں۔ اور وہی گلشن جو کسی وقت خزاں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا اب ابرِ بہاری کے زور سے رونق پر آ رہا۔ اور خوب رنگ نکال رہا ہے۔ امیر سہ

کیوں نہ ہو چہرے پہ اس کے خوشنما زلف سیاہ
ابر جب گلشن پہ آتا ہے بدل جاتا ہے رنگ

اضلاع متحدہ امریکہ کی محکومیت کی تہ میں بھی وہی عدم مساوات کام کئے جارہی تھی۔ جو قوم کے کچھ افراد باقی افراد سے روا رکھتے ہیں۔ یہ سمندر اس پار اور اس پار دو گوری آبادیوں کے درمیان مساوات کی جنگ تھی جو عرصہ تک ٹھنی رہی۔ نئی دُنیا کی دریافت ابھی کل کی بات ہے۔ یہ کرسٹوفر کولمس کی جدت طبع تھی۔ کہ پرانی دنیا کو نئی دُنیا کا پتہ لگا۔ وہ پولس[۱] سے ۳ر اگست ۱۴۹۲ء کو ایک بحری سفر پر روانہ ہوا۔ اور اسی سال ۱۲ر اکتوبر کو جزیرہ گوآنا ہانی[۲] پر جا پہونچا۔ اس نے کیوبا[۳] اور ہسپانیولہ[۴] کے کنارے اُتر کر ایک چھوٹی سی چوکی

۱؎ Polas
۲؎ Guanahoni
۳؎ Cuba ۴؎ Hispaniole

بنائی۔ اور ۲۴ مارچ ۱۴۹۳ء کو لسبن[۱] ہوتا ہوا اسپین واپس پونچا۔ یہ بحری مہم جو کہ کولمبس کے زیر قیادت روانہ ہوئی تھی۔ اصل میں شاہ فرڈیننڈ کے الطاف خسروانہ کا نتیجہ تھی۔ کولمبس نے ستمبر ۱۴۹۳ء سے نومبر ۱۵۰۴ء تک ویسٹ انڈیز[۲] کا علاقہ دریافت کر کے جنوبی امریکہ کے وسطی علاقہ کیطرف عنانِ توجہ پھیری۔ اسیطرح فرانسیسیوں۔ پرتگالیوں اور انگریزوں نے بھی طبع آزمائیاں کیں۔ اور اپنی اپنی مہمیں روانہ کیں۔ انکی آپس میں لڑائیاں بھی ہوتی رہیں۔ آخرش ۱۵۷۸ء میں سر ہمفرے گلبرٹ[۳] نے نئی بستیوں کی دریافت کا چارٹ حاصل کیا۔ اور وہ نیوفونڈلینڈ[۴] میں بستی بسانے کے لئے ایک مہم پر روانہ ہوا۔ مگر اس میں اسکی جان ہی جاتی رہی۔ اس کام کو پھر اسکے بھائی سر والٹر ریلے[۵] نے سنبھالا مگر اس کی کوشش بھی بارآور نہ ہوئی۔ پھر ورجینیا[۶] کمپنی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ۱۶۰۷ء میں پہلی بستی ورجینیا میں آباد کی۔ جو تماکو کی کاشت کی وجہ سے خوب پھلی پھولی۔ اس کے بعد ۱۶۲۰ء میں وہاں ایک اور بستی آباد ہوئی۔ اسی اثنا میں ایکسو ایک مرد عورت اور بچے جن پر مذہب کی آڑ میں ظلم و ستم توڑے گئے تھے کمپنی مذکور سے اجازت لے کر اس طرف روانہ ہو پڑے۔ اور انہوں نے کیپ کاڈ[۷] اتر کر

---

[۱] Lesbon [۲] West Indies [۳] Hamphray Gilbert [۴] Newfoundland [۵] Walter Raleigh [۶] Virginia [۷] Cape Cod

پلائی موتھ[۵۱] کی بستی بسائی۔ اِن دو مرکزوں اور بعد کی آبادیوں سے انگریزوں کی تیرہ[۱۳] بستیاں بن گئیں۔ جو اضلاع متحدہ امریکہ کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اِن نو آبادیوں نے نیدرلینڈ[۵۲] (حال کا نیویارک) کی ڈچ بستی اور دلاور[۵۳] کی سویڈش بستی بھی اپنے اندر جذب کر لی[۵۴]۔ یہ بستیاں جب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوئیں۔ تو ان کو اپنے اندر حکومت خود مختاری قایم کرنے کا خیال ہوا۔ اور وہ انگریزی حکومت سے جس کے تحت وہ آئینی طور سمجھی جاتی تھیں۔ بتدریج اپنی خود مختارانہ حیثیت حاصل کرتی رہیں اور آخر ۱۷۶۵ء میں جبکہ انگلستان کی حکومت نے امریکہ میں ایکٹ اشٹام نافذ کرنے کا تہیہ کیا۔ تو سارا ملک اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر وہ جنگ ہوئی جسے تاریخ میں جنگ آزادی امریکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِس ایکٹ کے نفاذ کے چند اسباب تھے انگلستان میں پارلیمنٹ کا ہیولی سب سے پہلے ایڈورڈ اول کے عہد میں تیار ہوا۔ مگر اس وقت پارلیمنٹ سن طفولیت میں تھی۔ اور دارالامرا اور دارالعوام کا کہیں وجود نہ تھا۔ ان جماعتوں کا قیام ایڈورڈ سوم کے عہد حکومت کے سنہری کارناموں کا ایک تتمہ ہے۔ اس پارلیمنٹ نے زمانے کا بہت گرم سرد دیکھا۔ اور شاہ جارج سوئم کے عہد میں تو اسکا رہا سہا اقتدار ہی مٹ گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے اقتدار کا مٹنا گویا عوام کے اقتدار کا

---

۵۳ Dilawar ۵۲ Netherland ۵۱ Plymouth

۵۴۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ آرٹیکل امریکہ۔

مٹنا تھا۔ اب ملک پر وزرا، و امرا کی جماعت ہی حکمران تھی۔ اور حقیقتہً وہی "بادشاہ" تھی یہ وزرا جماعت وگ سے تھے۔ اور پارلیمنٹ کے آدھے ممبر بھی اسی جماعت سے چنے جاتے تھے۔ جب پارلیمنٹ کو کوئی بل پاس کرانا ہوتا۔ تو یہی ممبر باقی ممبروں کے ووٹ بھی حاصل کر لیتے تھے۔ تو گویا اب پارلیمنٹ امرا کی بیٹھک ٹھونک رہی تھی۔ اور عوام کی نمائندگی سے دست بردار ہوئی جاتی تھی۔ ایک تو اس طرح عوام کے حقوق پر چھری چل گئی۔ دوسرے جارج سوئم نے خود پسندی کا ایک نیا باب کھول کر قومی تفرقہ و تشتت کی بنیاد رکھی۔ اگر صرف نام پیدا کرنے کی آرزو اس کے دل میں تڑپ رہی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر وہ تو ساری حکومت ہی خود سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی حکومت کے پہلے بیس سال اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا۔ کہ کسی طرح وزرا کا اقتدار گھٹے اور اس کا بڑھے۔ اس ہاتھا پائی میں ضروری تھا۔ کہ عوام کچلے جاتے۔ اور فی الواقع کچلے جاتے رہے۔ تیسری بات یہ تھی کہ جارج سوئم کی والدہ بڑی بلند پرواز ملکہ تھی۔ وہ ہمیشہ اسی فکر میں ڈوبی رہتی۔ کہ کسی طرح تمام اختیارات اُسکے بیٹے کے ہاتھ میں آجائیں۔ اور وہ "رعایا کا باپ" بن جائے۔ وہ اپنے بیٹے کو کہتی رہتی کہ "جارج بادشاہ بنو" اور بادشاہ تمام عمر اسی تمنا میں بیتاب رہا۔ اور والدہ کی اسی نصیحت پر بڑے طمطراق سے گرم پیکار رہا۔ اس زمانے کے لوگ بھی عجب کینڈے کے تھے۔ کہ انہوں نے بادشاہ کا دم ناک میں کئے رکھا۔ اور اُسے کسی پہلو چین نہ

ف ۵ Whig

لینے دیا۔ بادشاہ خود جاہل۔ تنگ دل۔ خود سر اور خود رائے تھا۔ اسکے ان فطری خصائل کا رعایا کے مراقف پر اور بھی بُرا اثر پڑا۔ اس نے اپنا مطلب نکالنے کو طرح طرح کے جال پھیلائے اور رشوت ستانی۔ اور ستم رانی کا بازار بھی گرم کیا۔ تخت نشینی ہوتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ وزیر اعظم پٹ کو رخصت کر کے قلمدان وزارت اپنے منظور نظر اتالیق بیوٹ[۱] کے سپرد کر دیا۔ بیوٹ نے جماعت شاہ کو وجود میں لانے کی خاطر اپنے طرفداروں کو بڑے بڑے عہدے دیکر انکی عزت افزائی کی۔ اور اس طرح قوم کی متحدہ طاقت کو منتشر کر دیا۔ اس پر بڑا غضب یہ ہوا کہ عین اس وقت جبکہ انگلستان کے سیاسی اسٹیج پر یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ بادشاہ سے ایک بڑی چوک ہوئی جس سے عوام کی بالکل بے وقری ہوتی تھی۔ بادشاہ نے التوائے پارلیمنٹ کے موقعہ پر ایک تقریر کی۔ جس پر ولکز[۲] کے اخبار نارتھ برٹن میں سخت نافذانہ حملہ کیا گیا۔ یہ ولکز ایلسبری[۳] کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ بادشاہ کے حکم سے اس اخبار کے مولفوں۔ پرنٹروں اور پبلشروں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور ولکز مع چالیس رومیوں کے نظر بند کیا گیا۔ اس نے جلد ہی ہیبس کارپس ایکٹ[۴] کے تحت رہائی حاصل کر لی۔ اور گورنمنٹ کے خلاف ممبر پارلیمنٹ کو

ف[۱] Bute ف[۲] Wilkes ف[۳] Aylesbury

ف[۴] Habeas Corpus Act

گرفتار کرنے کی علت میں قانونی چارہ جوئی کرکے کامیابی حاصل کی۔ اس پر گورنمنٹ کی بڑی کرکری ہوئی۔ مگر پارلیمنٹ نے جو امراء و وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ ولکز کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی میں فوجداری مقدمہ چلایا۔ جس پر گورنمنٹ اور عوام کی کچھ چپقلشیں ہوئیں اور لوگوں نے "ولکز اور آزادی" کے ایسے فلک شگاف نعرے لگائے کہ سارا ملک گونج اٹھا۔ عوام بادشاہ اور اُسکی والدہ پر بھی برس پڑے اور دنوں میں ہی اس قدر توہین آمیز مضامین شائع کئے گئے کہ دو سو پرنٹروں پر مقدمات چلائے گئے۔ اور ولکز جلا وطن ہو کر فرانس کی طرف نکل گیا۔ مگر لوگوں کا جوش پھر بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔

سنہ ۶۹ء میں ولکز انگلستان واپس آیا اور وہ مڈل سیکس[۵] کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر چنا گیا۔ بادشاہ یہ سن کر لال بھبوکا ہوگیا۔ اور اس نے گورنمنٹ کو دست اندازی کرنے پر مجبور کیا۔ حکومت کی کیا مجال تھی کہ کان ہلاتی۔ اس نے ولکز کو قید کرکے دھندا چلتا کیا۔ اس سے شہریوں کا پرانا گھاؤ پھر تازہ ہوگیا۔ اور وہ تاڑ گئے کہ حکومت اب بھی دھونس ڈال کر کام نکالا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ بے محابا بلوے کرکے حکومت کا قافیہ تنگ کرنے لگے۔ پارلیمنٹ کی ڈھٹائی دیکھئے۔ کہ اُس نے ان کڑے حالات میں بھی یہ اعلان کر دیا۔ کہ ولکز نشست حاصل کرنے

---

۵ Middle Sex

ہیں ناکام رہا ہے۔ عوام اور بھی جل بھن گئے۔ اور انہوں نے اُسے پے در پے چار دفعہ ممبر چنا۔ پارلیمنٹ نے برعکس امیدوار مقابل کرنل لٹرل[ا] کے چناؤ کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اُسے ۱۱۴۳ ووٹوں کے مقابل میں صرف ۲۹۶ ووٹ ملے تھے۔ یہ پارلیمنٹ کی چیرہ دستی اور اُسکی انتہائی حماقت تھی۔ کیونکہ اس سے ملک و ملت کے حقوق پر پانی پھر جاتا تھا۔ لوگ اس حرکت سے سخت برہم ہوئے۔ اور انہوں نے بادشاہ پر جبکہ وہ پارلیمنٹ کا سشن ختم کرنے کو جا رہا تھا۔ بڑی لے دے کی۔ اور اس پر آوازے کسے۔ ولکز پر لوگوں کی فریفتگی دیکھئے کہ جب وہ اپریل ۱۷۷۰ء میں قید خانے سے باہر آیا تو لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور شاہی محل کی اگلی دیوار پر لفظ آزادی بڑے بڑے سنہری حروف میں ثبت کر دیا گیا۔

چوتھی بات یہ ہوئی کہ انگلستان اس وقت مشینوں اور کلوں کا متوالا ہو رہا تھا عوام نے جب دیکھا کہ اب انہیں بھوکوں مرنا ہے۔ تو انہوں نے کئی بار سرمایہ داروں کی مشینیں اور کارخانے سپرد آتش کئے۔ اس سے بھی طبقہ امرا و وسطیٰ کے کانوں پر جوں نہ رینگی۔ مالکان اراضی کو اب اور سوجھی۔ انہوں نے خالی زمینیں زیر کاشت لانی شروع کر دیں۔ اس سے بھی عوام بگڑ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ اب اُن کے لئے کا ہچرائی کی زمینیں ناپید ہو رہی تھیں۔ اس طرح امرا زیادہ امیر اور غربا زیادہ

ا۔ Luttrel

غریب ہونے لگے۔ تاریخ انگلستان کا ایک مولف لکھتا ہے۔ کہ اب بڑی مشکل یہ پیش آئی جواب تک برابر بڑھے جا رہی ہے۔ کہ امیر زیادہ امیر ہونے لگے اور غریب زیادہ غریب"[1] اس وقت قوم میں صنعت کاروں تاجروں اور کانوں میں کام کرنیوالوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جنگی۔ پرمٹ تجارتی صلحنامے اور ملکی ٹیکس اِن لوگوں کے لئے بڑے مفید ثابت ہو رہے تھے۔ پارلیمنٹ مالکان اراضی اور سرمایہ داروں کے قبضہ اقتدار میں تھی۔ اِس لئے جو قانون بنتا۔ اُس سے سرمایہ داروں کی ہی ہوا بندھتی۔ اور عوام بچارے چیختے چلاتے۔ اور اُوچھے ہتھیاروں پر بھی اُتر آتے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔ ؎

گل گراں گوش سنگدل صیاد
کون سنتا ہے چیخ بلبل کی

رو پیٹ کر چپ ہو جاتے۔ اور حکومت کو دِل ہی دِل میں کوستے۔ یہ تھی اس وقت انگلستان کی اندرونی حالت جبکہ اُس کی امریکہ سے جنگ چھڑی۔ انگلستان والے اس وقت مساوات کے جان پرور آئین سے ناآشنا ہوئے جاتے تھے۔ اِس لئے سمجھو تو یہ جنگ خواص و عوام اور حاکم و محکوم کی رقابتی جنگ تھی۔ انگلستان اسوقت اُن لڑائیوں کی وجہ سے جو اُس نے امریکہ کی خاطر لڑی تھیں۔ مقروضیت کے بارگراں

---

[1] تاریخ انگلستان از بکلے۔ ص ۲۸۷

کے نیچے دب رہا تھا۔ اِس لئے اُسے روپیہ اینٹھنے کی یہ ترکیب سوجھی کہ اُس نے امریکہ میں اسٹامپ ایکٹ جاری کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اگر انگلستان والے یہ معاملہ امریکہ کے اپنے فیصلے پر چھوڑ دیتے۔ تو پھر بھی کوئی بات تھی۔ لیکن اہل انگلستان اس زعم میں تھے کہ امریکہ کی ساری نوآبادیوں میں اُن کا راج ہے۔ کون کوئی اُن کے کسی کام پر کان ہلائے گا۔ اِس لئے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ خود ہی فیصلہ کر دیا۔ مگر اہل امریکہ تھے گھر کے بھیدی۔ اور گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ وہ بگڑ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عہد کر لیا۔ کہ وہ انگلستان کا بنا ہوا سامان نہ خریدیں گے۔ انہی دنوں چائے بلور سیسہ۔ رنگ۔ اور کاغذ پر جو انگلستان سے امریکہ جاتا تھا۔ کچھ محصول لگا دیا گیا تھا۔ باقی چیزوں کا محصول تو جلد ہی ہٹا دیا گیا۔ مگر چائے کا محصول اسی طرح رہا۔ اسی سلسلہ میں بوسٹن کے شہریوں اور سپاہیوں میں کچھ دست بدست لڑائی ہوئی۔ جس میں کچھ شہری مارے گئے اور امریکہ والوں نے حلف اٹھائی۔ کہ اب وہ چائے نہ خریدیں گے اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بڑا گھاٹا پڑا۔ اور اس نے ایک جہاز چائے کا بوسٹن کی بندرگاہ میں دھکیل ہی دیا۔ جب جہاز لنگر انداز ہوا۔ تو مسلح ملکیوں کی ایک جماعت نے چائے کی تمام پیٹیاں کلہاڑیوں سے چیر پھاڑ دیں۔ اور ساری چائے سمندر میں پھینک دی۔ اِس جرم کی پاداش میں لارڈ نارتھ نے پارلیمنٹ انگلستان سے یہ بل پاس کرایا۔ کہ بوسٹن کی بندرگاہ مسدود

ط Boston

کردی جائے۔ اور مساچوسٹز[۵۱] کا چارٹر[۵۲] منسوخ کر کے ایک کونسل نامزد کی جائے۔ اس سے
سارے امریکہ میں سناٹا سا چھا گیا۔ اور نو آبادیوں کے نمائندوں نے فلاڈلفیا[۵۳] میں
جمع ہو کر یہ رزولیوشن پاس کر دیا۔ کہ جب تک مساچوسٹز کے حقوق واپس نہ لیں گے
انگلستان کے ساتھ تاجرانہ راہ و رسم بالکل بند رہے گی۔ اور ملکی فوج ترتیب دیجائیگی
اس پر بھی انگلستان کا شاہ اور پارلیمنٹ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اور ۱۷۷۵ء میں
انگلستان میں یہ اعلان کر دیا گیا۔ کہ مساچوسٹز میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اسلئے
جنرل گیج[۵۴] کو نو آبادیوں کا سامان جنگ تلف کرنے بوسٹن روانہ کیا گیا۔ یہ تھی دعوت
مبارزت جو امریکہ کو دی گئی۔ اس کے بعد برابر سات سال تک امریکہ اور انگلستان
میں لڑائی ہوتی رہی۔ اور فریقین کی جان پر بن آئی۔ آخر ۱۷۸۲ء میں اضلاع متحدہ
امریکہ کی آزادی تسلیم کر لی گئی[۵۵]۔ اس وقت کے لوگوں کی اس ساری کارروائی کا
مطلب یہ نکلا۔ کہ انہوں نے اپنے ہی گھر میں سیندھ دے کر اپنی ہنرمندی کا
بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور جو رشتہ اتحاد ان کا اپنے بھائیوں سے بندھا تھا۔ وہ توڑ دیا
یہ رشتہ اتحاد تو تھا بڑا نازک۔ فریقین سمجھے بیٹھے تھے کہ استوار ہے اب جو ٹوٹا تو
پھر نہ جڑا اور کلنک کا ٹیکا ماتھے لگا۔ اب ان ٹوٹے دلوں کا جڑنا کیسا اور کہاں کا؟

---

۵۱ Messachusetts ۵۲ Charter ۵۳ Philadelphia
۵۴ Gage ۵۵ تاریخ انگلستان بی آزادیٔ امریکہ۔

اہل انگلستان تو اپنی بگڑی بنانے اور اپنی حالت سنوارنے کے در پے تھے۔ اور اہل امریکہ مرنے مارنے پر طیار تھے۔ اب دونوں میں ملاپ ہوتا تو کیسے۔ اتحاد ہوتا تو کیونکر؟ امیر ؎

وہ آمادہ سنورنے پر ہم آمادہ ہیں مرنے پر
ادھر وہ بنکے بیٹھے ہیں۔ ادھر ہم تنکے بیٹھے ہیں

اے پیاری امریکہ! اے ساری دنیا کی دلہن امریکہ! تجھے یاد ہے کہ جب تو نے اپنی اماں جان ؎ سے لڑائی ڈالی۔ تو پھر تیری زمین پر کیا کیا ان پڑے۔ کیا کیا یدھ ہوئے۔ تجھے یاد ہوگا۔ کہ طرفین کے توپ خانوں نے جو دوزخ کا دہانہ اور آگ کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ کیا کیا غضب ڈھایا۔ اور کیا کیا ستم برپا کئے۔ مگر اے امریکہ! اے دنیا کی جان امریکہ! تو بھی دھن کی پکی نکلی۔ کہ کئی سال تک لڑتی رہی۔ اور اپنی بات سے نہ ٹلی۔ تیری اپنی اماں جان سے خوب ہشت مشت ہوئی۔ تو نے اس سے دو دو ہاتھ خوب کئے۔ اس نے بھی تجھ پر ایسا وار کیا تھا۔ کہ اگر خالی نہ جاتا تو تجھے بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ اس نے تجھے تلوار کا وہ ہاتھ دیا تھا۔ کہ اگر تو کنی نہ کاٹتی تو پھر تو دیکھتی کہ تیرا کیا حشر ہوتا۔ تیری قسمت یاور تھی کہ تو بچ نکلی اور ایسی پھلی پھولی کہ اپنی مادر مہربان کا پھول سا چہرہ بھی خار سے مرجھا دیا۔ اب تیرے اقبال کی یہ حالت ہے کہ تیری زمین آسمان سے سر جوڑتی ہے۔ تیرا آسمان فلک الافلاک سے ٹکر لیتا ہے۔ تیرے اکاس سے آزادی کی روح پرور لپٹیں آتی ہیں۔ تیرے گلی کوچے مال و

؎ Mother Country

دولت کے بھرے خزینے دکھائی دیتے ہیں۔ تیرے شہر صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن کے گہوارے نظر آتے ہیں۔ تیرے مدارس علوم وفنون کی جان اور حکمت و فلسفہ کی کان ہیں۔ تیرے دفاتر سیاست دانی کی اونچی اونچی دکانیں ہیں۔ نہیں نہیں طبلۂ عطار ہیں۔ جہاں سے سیاست کی بوئے معنبر ساری دنیا کے مشام جان کو پہنچتی ہے۔ غرضیکہ تیری زمین کا چپہ چپہ باغ ارم کیا بہشت بریں کا نمونہ ہے۔ دنیا بھر کی روشنی تیری یونیورسٹیوں کی گود ہیں تیرے کالجوں کے دامن میں ہے اور ساری دنیا کی رعنائی اور ہوشمندی تیری دختر رز کے گھونگھٹ میں ہے۔ اب دنیا کا کونسا کمال ہے۔ جسکا سہرہ تیرے سر نہ بندھا۔ اور اقبال کا کونسا ستارہ ہے۔ جو تیرے آسمان پر نہ چمکا۔ جہاں کسی وقت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں اب روشنی ہی روشنی ہے۔ جہاں کسی وقت کسی کونے میں بھی کوئی ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اب وہاں ڈال ڈال پات پات چراغ کیا چاند وسورج نمودار ہورہے ہیں۔ خدا کی شان! تو نے دنوں میں ترقی کی تمام منزلیں نکال لیں۔ اور تحت الثریٰ سے ثریا تک جا پہنچی۔ اس وقت تیرا چمن زار دنیا جہاں کی خوبیوں اور لطافتوں کا مجموعہ ہے۔ اس چمن میں جہاں کسی وقت خزاں کا دور دورہ تھا۔ اب بہار کا سماں بندھا ہوا ہے۔ ہوا ملار گا رہی ہے۔ پتیاں ستار بجا رہی ہیں۔ نوجوانان چمن تالیوں سے تال دیتے ہیں۔ پھول تیری اٹھان دیکھ دیکھ کے پھولے نہیں سماتے۔ اور کلیاں تیرا رنگ چمن دیکھ دیکھ مسکراتی اور جوش مسرت میں اپنا

دامن چاک کئے دیتی ہیں۔ تیری یہ آن بان شان دیکھ دیکھ کر آسمان کی آنکھیں نیچے ہوئی جاتی ہیں۔ اور دنیا جہان کی نگاہیں تیرے رُخ روشن پر نثار ہوئی جاتی ہیں۔ تیرے شعلہ روؤں کی اٹھان سورج کو آنکھ مار رہی اور تیرے ماہ جبینوں کا حسن چاند کو ماند کر رہا ہے لیکن حیرانی کی بات ہے۔ کہ اب تیری اس سرزمین پر امنگوں اور آرزوؤں کی چھاؤنی چھا رہی ہے۔ اور تیرے آسمان پر ملوکیت کی اودی اودی گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔ تیرے باغ میں جو خیر خواہی کے پھول تھے۔ وہ منہ کھولے محو حیرت ہیں۔ اور خود غرضی کے شگوفے منہ پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے ہیں اور تیرے کان بھر رہے ہیں۔ تو دولت کی کان ہے۔ اور دولتمندوں کے کان مروڑ رہی ہے۔ تو امارت کی جان ہے۔ اور امیروں کی جان لیا چاہتی ہے۔ تو آزادی کی پتلی ہے۔ اور آزادی کی آنکھ سے پتلی نکالا چاہتی ہے۔ تو صنعت و حرفت کی لونڈی ہے۔ اور دنیا کی صنعت و حرفت کو لونڈی بنایا چاہتی ہے۔ اللہ! اللہ! یہ کیا شان خداوندی ہے! کل کیا اور آج کیا! کیا تجھے علم نہیں کہ وصل کی راتیں ہوا کی طرح نکل جاتی ہیں۔ اور خوشی کے دن باتوں میں گذر جاتے ہیں۔ وہ دن یاد کر جبکہ تو کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ اور تیرے پیدا کرنے والے نے تیری دولت تیرے سپرد کر دی۔ اور تجھے گھر کی ملکہ بنایا۔ وہ دن یاد کر جبکہ تو نے کچھ اصول باندھ کر تمام دنیا کو صلح و آشتی کا پیغام دیا۔ تیرے وہ وعدے کیا ہوئے!

امیر سے

اب تو بھولے سے بھی کرنا نہیں تو یاد ہمیں
جتنے وعدے تھے سب اے عہد شکن بھول گئے

تو جاپان پر اس لئے منہ آتی ہے کہ وہ تیری بحری طاقت سے ٹکر لے رہا ہے اور تیری تجارت کو پھیکا کر رہا ہے۔ تو جرمنی سے اس لئے جل رہی اور انگاروں پر لوٹ رہی ہے کہ اسکے کارخانوں کی چنگاریاں تیرے تن بدن پر پڑ رہی ہیں۔ تو انگلستان سے اس لئے بنا ہے جا رہی ہے کہ وہ تیری اماں جان ہے۔ شاباش۔ شاباش! فرمانبردار اولاد اسی طرح کرتی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اسکا دودھ اور خون تیری رگوں میں جوش مار رہا ہے۔ اس وقت ساری دنیا اپنی ساری کائنات لے کر تیرے قدموں میں لوٹے جاتی ہے۔ اور تو اسکی آزادی مسلنا چاہتی ہے۔ آسمان کس آڑے وقت میں تیرے کام آیا۔ اور اس نے تجھ پر اپنے فضل و کرم کا مینہ برسایا۔ مگر تو ہے کہ اب اُسے باتوں میں اُڑا رہی ہے۔ یہ کس برتے پر؟ اُٹھ اُٹھ تو کس نیند سو رہی ہے۔ وہ دن بھی آیا چاہتا ہے۔ جبکہ تیرا چاند رہے گا نہ تیرے ستارے۔ اور تیری محفل اکھڑ جائے گی۔ امیر؎

دنیا بے ثبات میں کیا ہو ہمیں ثبات
جس گھر میں ہم مقیم وہ گھر ہی سفر میں ہے

تو نے بے شک شراب چھوڑی۔ مگر ابھی تک چار نشے۔ بحری طاقت علمیت تجارت اور دولت کے تیرے سر پر سوار ہیں۔ جب تک تو ان سے نہ بچے گی۔ تیرا اقبال کی

گود میں جھولا جھولنا معلوم! وہ تیری آزادی کی جنگ تھی۔ اب یہ تیری طاقت اور دولت کی جنگ ہے۔ جو تو ساری دنیا سے لڑنا چاہتی ہے۔ دیکھئے تیرا اس جنگ میں کیا حشر ہوتا ہے۔ تو پیچھے ہٹتی ہے یا آگے بڑھتی ہے۔

اے انگلستان! اے عروس جہاں! تیری حکمت عملی۔ تیری پختہ مغزی اور تیری بحری طاقت کی دھوم چاروں طرف ہے۔ جرمنی تیری اٹھان دیکھ دیکھ کر جلتی رہی اور تیرے خلاف منصوبے باندھتی رہی۔ اور آخر تجھ پر پل پڑی۔ اور اس نے تیرا کچومر ہی نکال دیا تھا۔ اگر تو اپنی زبردست ڈپلومیسی سے اس کا جواب نہ دیتی۔ جرمنی اپنے فوجی ساز و سامان اور اپنے کارخانوں کو دیکھ دیکھ کر اندھی ہو رہی تھی۔ اور اس بات سے غافل ہوئی جاتی تھی۔ کہ قوم کی طاقت کئی باتوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اسی گھمنڈ میں ماری گئی۔ کہ اسکے سامان جنگ کا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسمیں شک نہیں کہ "قوم کی آبرو تلوار کی آبداری اور توپ و تفنگ کی آتشباری سے ہوتی ہے۔ مگر اس سے بھی تو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ ڈپلومیسی بھی قوم کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ اور باتیں۔ جرمنی میں اس بات کی کمی تھی۔ جس سے اسکا ہاتھ اوچھا پڑا اور تو بچ نکلی۔ اے ساری دنیا کی دلہن! "تیرا گہنا کیا کہنا" تیری زمین ہے تو تھوڑی۔ مگر جس قدر بھی ہے بہشت بریں کا ٹکڑا ہے۔ تیرے زائرین کو تیرے بازاروں میں چلتے ہوئے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ باغ کے خیابان میں چلے جا رہے ہیں۔ تیرے باغوں میں وہ پھول کھلتے اور وہ جانور چہکتے ہیں۔ کہ وہ لہک اُٹھ

چہک ساری دنیا میں گل کو حاصل ہے نہ بلبل کو۔ سارے پانیوں پر تیری حکومت ہے
چاروں طرف تیری نو آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ گویا کہ ہر جگہ تیرا نال گڑا ہے۔ اور تیری
محبت نے تمام دنیا کو دبوچ رکھا ہے۔ تو قوموں میں اس طرح پر ہے جس طرح
سلکِ گوہریں میں بیچ کا دُردانہ اور ساغرہائے مے میں کے وجم کا پیمانہ۔ تیرے امن
سے وہ وہ بلند بخت پل کر نکلے جن کی نظیر دُنیا پیش نہ کر سکی۔ تیری گود میں وہ
وہ شہسوار پل کر جوان ہوئے جنہوں نے نپولین اعظم اور قیصر جرمنی کو گرد کر دیا۔ تیرا
ایک ایک سپوت بہادری اور دلاوری میں سیفِ بران اور چراغ علم کے لئے قندیل
فروزاں ہے۔ جبھی تو تیرے قد پر عقل و دانش کا جامہ ٹھیک آیا۔ تو حکمت عملی میں
اوروں کے کان پکڑواتی ہے۔ اور تیرے گھر میں رمزیں بڑوں بڑوں کے ذہن میں
بھی نہیں آتیں۔ صباؔ

غوطے کھلواتی ہیں کیا رمزیں تری اے بحرِ حسن
تھاہ اک اک بات کی دو دو پہر ملتی نہیں

جنگِ گذشتہ کے بعد روس میں کیا ہوا؟ وہاں ایک انقلاب انتہائی صورت
میں پھوٹ پڑا۔ ان دنوں روس کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مطلع پر تاریکی
چھائی ہوئی تھی۔ اور سارے ملک میں اندھیر پڑا تھا۔ وہاں اس انقلاب کی بڑی
وجہ یہ ہوئی کہ کاشتکار اور مزدور کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اور اس کے
علاوہ زار کی جابرانہ اور استبدادانہ حکومت نے لوگوں کا رہا سہا کچومر بھی نکال

رہا تھا۔ تو گویا اُس کے اندر قریباً وہ تمام باتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ جو بعض افراد کی دولتمندی۔ اور سرمایہ داری۔ اور حکومت کی جابرانہ حکمت عملی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ طبقہ اُمرا۔ دولت۔ حکومت اور زراعت پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ اور اُن میں غربا کا حصّہ برائے نام رہ گیا تھا۔ قوم کا غریب افراد کے ساتھ بھی سلوک ظالمانہ تھا۔ ہمسایہ قوموں کے ساتھ بھی اُس کا سلوک استبدادانہ اور جابرانہ تھا۔ وہ ہمیشہ اِسی تاک میں رہتی۔ کہ کوئی ہمسایہ قوم ذرا آنکھ جھپکے۔ اور یہ اُس کے جان و مال کی لاگو بنے۔ اُس نے ایران، ترکستان۔ ٹرکی وغیرہ وغیرہ میں جو اپنی ڈپلومیسی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ اور جو وہ بات بات پر اِن کا گلا دبا لیتی تھی۔ اِس سے اس کی حریت پسندی اور داد گستری کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ ۱۸۶۱ء سے پہلے وہاں غلامی سے ملتا جلتا صرفڈم[۵۱] کا ایک نظام رائج تھا۔ جس کے رُو سے مالکان اراضی کو کاشتکاروں پر بہت بڑا اقتدار حاصل تھا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ نظام ہٹا دیا گیا۔ جب بھی زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت ہی رہی۔ اور ملک میں جو نیا قانون جاری کیا گیا۔ اُس کے رُو سے کاشتکاروں کو زمین حاصل کرنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا ہوتا۔ وہاں میر سسٹم[۵۲] کا رواج بھی ہوا۔ مگر اس سے بھی زمینداروں کو تکلیف کم نہ ہوئی۔ اِس کے رُو سے گو ۱۸۶۱ء سے ۱۸۹۲ء تک ساٹھ ملین ایکڑ زمین

---

۵۲ Mir System ۵۱ Serfdom

کاشتکاروں کے قبضے میں آئی۔ مگر پھر بھی اُن کو کاشت اراضی میں کافی سہولتیں حاصل نہ ہوسکیں۔ غریب طبقہ کی تکلیفیں یہاں تک ہی نہ تھیں۔ زمیندار۔ پہلے اپنی گھریلو دستکاری سے روزی کا کچھ حصّہ کما لیتے تھے۔ مگر جب قصبوں اور شہروں میں بڑے بڑے صنعتی اور حرفتی کارخانے کھل گئے۔ اور مشینوں اور کلوں سے کام لیا جانے لگا۔ تو اِن بیچاروں کا ذریعہ معاش اور بھی مخدوش ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء میں نوجوانوں کی ایک جماعت "زمین اور آزادی" کے نام سے وجود میں آچکی تھی۔ اور اُسے کچھ اقتدار بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اب روس کے اطراف واکناف سے "فیکٹریاں مزدوروں کے لئے اور زمین دہقانوں کے لئے" کا نعرہ بلند ہوا۔ اور اس سے سارا ملک گونج اٹھا۔ ۱۸۷۰ء سے کچھ عرصہ پہلے روس میں ٹریڈ آرگنیشن بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے قیام کی بڑی وجہ یہ ہوئی۔ کہ مزدوروں پر اس وقت کی سرمایہ دار حکومت کی طرف سے کچھ سختی شروع ہوئی۔ اور انہوں نے مل کر سٹرائیکیں کر دیں۔ ۱۸۷۹ء میں دار الخلافہ کی مزدور جماعت کے نام سے ایک اپیل شائع ہوا جس میں "ہر ایک سب کے لئے اور سب ہر ایک کے لئے" کا نصب العین جلی حروف میں دکھایا گیا۔ اب حکومت کو فیکٹریوں اور کارخانوں کے متعلق کچھ قانون بنانا پڑا۔ شومئی قسمت سے اُنہیں دنوں ۱۸۹۱ء

Trade organisation ؎

میں قحط پڑا جس سے تجارت کو سخت دھکا لگا۔ اور مزدوروں کی اجرتیں بھی گر گئیں مزدوروں نے پھر سٹرائیکیں شروع کر دیں جس پر ۱۸۹۲ء میں حکومت کیطرف سے فرمان نافذ ہوا۔ کہ سٹرائیک کرنے والے گرفتار کر لئے جائیں۔ اس وقت تک روس میں تین تحریکیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک مزدوروں کی۔ دوسری کاشتکاروں کی۔ اور تیسری انقلاب چاہنے والوں کی۔ یہ تینوں تحریکیں امیر طبقہ کی استبدادی کارروائیوں سے پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۸ء میں ایک لیبر پارٹی قائم ہوئی جس نے لینن[۵۱] کی قیادت میں اقتصادی اور سیاسی دونو پہلو اپنے اغراض و مقاصد میں شامل کر لئے۔ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۵ء تک مزدوروں اور دہقانوں کی سٹرائیکیں ہوتی رہیں۔ اور ملک بھر میں ایک ہنگامہ رستخیز برپا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں ان سٹرائیکوں کی تعداد چودہ ہزار تک اور اُن میں شامل ہونے والوں کی تعداد ۳ ملین تک جا پہونچی تھیں۔ ان سٹرائیکوں نے یہاں تک زور پکڑا کہ کاشتکاروں نے مالکانِ اراضی پر دھاوا بول کر ان کے سینکڑوں دیہاتی مکان جلا دیئے رعایا کی یہ دست درازیاں جب بغاوت کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ تو حکومت نے عوام کے مطالبات کے آگے جھک کر اعلانِ عام کے ذریعہ آئینی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کرنے کا یقین دلایا۔ اس پر دارالخلافہ میں ایک لیبر کونسل قائم ہوئی جس نے اعلان کیا کہ وہ غربا کی طرف سے حکومت کی باگ ڈور

---

[۵۱] Lenin

اپنے ہاتھ میں لینے پر تیار ہے۔ اِس اعلان پر ملک میں سوویٹ کونسلیں قائم ہوگئیں جس کے ممبر زیادہ تر سوشلسٹ جماعت کے لوگ تھے۔ اور ان کا لیڈر ٹراٹسکی بھی اسکا ایک ممبر تھا۔ ۱۹۰۶ء میں نظام اراضیات میں بہت کچھ تغیر ہوا اور دہقان زمینوں کی ملکیت حاصل کرنے لگے۔ اِس کے بعد ہی یورپ گذشتہ جنگ عظیم میں کود پڑا۔ اور روس میں اور بھی ترقی نے راہ لی۔ ۱۹۱۵ء میں سوٹرز لینڈ میں سوشلسٹ جماعت کی ایک کانگریس ہوئی۔ جس میں روس کی تمام انقلاب پسند جماعتیں شامل ہوئیں۔ وہاں ٹراٹسکی کا ترتیب دیا ہوا اعلان پڑھا گیا۔ حامیان جنگ کو جی بھر کوسا گیا۔ اور حکومت سے امن امان کا مطالبہ کیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں پھر دوسری کانگریس اسی قسم کی ہوئی۔ اس نے بھی وہی مطالبات پیش کیے۔ ۱۹۱۷ء میں دارالسلطنت میں خوراک کی کمی ہوئی۔ اور مزدوروں اور کاشتکاروں نے سٹرائکیں شروع کردیں۔ اور سارے ملک میں ایک ہلڑ مچ گیا۔ زار نے اِن حالات کے دبانے کے لیئے اپنے وزیروں کے مشورے سے ڈوما کو جو نیابتی حکومت کی آئین بردار جماعت تھی۔ برطرف کردیا۔ مگر انقلابی پارٹی نے اِس برطرفی کو حقارت سے ٹھکرایا۔ اور ایک اگزکٹو کمیٹی بنا کر زار سے تخت چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ زار نے جب قوم کے تیور بے طرح بدلے دیکھے۔ تو تاج و تخت سے الگ ہوا۔ اِس پر ڈوما نے اُسے گرفتار کرکے عارضی حکومت قائم کردی۔ جس کا مقدمتہ الجیش کرنسکی قرار پایا۔ سوشلسٹ جماعت پھر بھی نچلی نہ بیٹھی۔ وہ اپنے قائد لنن اور ٹراٹسکی کا اقتدا

قائم کرنا چاہتی تھی۔ لنن نے اس وقت ملک کے سامنے یہ پروگرام پیش کیا :-

(الف) جنگ فوراً بند کر کے غیر مشروط صلح کا اعلان کیا جائے۔

(ب) حکومت امیر طبقہ سے چھین کر غریب طبقہ کے ہاتھ میں دیجائے۔

(ج) حکومت کو سپاہیوں اور مزدوروں کی کونسل کے حوالہ کر کے جمہوریت قائم کی جائے۔

(د) اراضیات ضبط ہو کر ملک کی ملکیت قرار پائیں۔

(ہ) تمام بنکوں کا ایک قومی مرکزی بنک بنایا جائے۔

(و) پولیس فوج اور سول سروس کے موجودہ ملازم تخفیف میں لائے جائیں۔

(ز) تمام ملازم انتخاب سے لئے جائیں۔ اور ان کو اچھے مزدور کی اوسط اجرت کے مطابق تنخواہ ملے۔

لنن اور ٹراٹسکی کی جماعت نے ملک میں بغاوت پیدا کرنی چاہی۔ مگر ان کی کوششیں کچھ بارآور نہ ہوئیں۔ اس لئے حکومت نے ان کو گرفتار کرنا چاہا۔ لنن تو بھاگ گیا۔ مگر ٹراٹسکی گرفتار ہوا۔ اس کے بعد ملک کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ اور انقلاب و افتراق کی روح فرسا صدائیں فضائے روس پر اور بھی گونجنے لگیں۔ دہقان زمینوں پر اور مزدور کارخانوں پر قابض ہو گئے۔ اور فوج حکومت کے احاطہ اختیار سے باہر ہو گئی۔ آخر ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو آل ایشن سوویٹ کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس وقت لنن بھی آن پہونچا۔ اس نے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی جو بارآور

ہوئی ۔ ۷ نومبر کو کانگریس مذکور کا اجلاس ہو رہا تھا۔ کہ فوج نے ارکانِ حکومت کو گھیر کر ونٹر محل پر قبضہ کر لیا عین اس وقت ٹراٹسکی بھی آموجود ہوا۔ اور اس نے اعلان کر دیا۔ کہ موجودہ حکومت کا پیمانہ حیات لبریز ہو چکا ہے۔ اس موقعہ پر فریقین میں کچھ دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ مگر ارکانِ حکومت فوج کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ اس لئے گرفتار ہوئے۔ کرنسکی اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔ اور ملک میں ایک انوکھی قسم کی جمہوریت قائم ہوئی[۱]۔ یہ ساری کشمکش ہے۔ اُس بے انصافی کی جو ہر دور انحطاط میں قوم کو تگنی کا ناچ نچاتی۔ اُسے ناک چنے چبواتی ۔ اور اس کا وقار خاک میں ملا دیتی ہے۔ قومیں یہاں پہنچکر ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں مگر کیا بھی کیا جائے۔ بے انصافی اور عدم مساوات کا جال دنیا کے چپہ چپہ پر بچھا ہوا ہے۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں جو اس کی تلخی کی لذت چشیدہ نہ ہو کیونکہ یہ قدرت کا بندھا ہوا آئین ہے کہ قوم کی عقل جب ایک مذموم جذبہ کی لونڈی بن جاتی ہے۔ تو پھر وہ ایسے غلط دہرے پر جا پڑتی ہے کہ عدل و انصاف کے منتھر ہی بگڑ جاتے ہیں۔ اور قوم محفل اقوام سے باہر نکالی جاتی اور داغ حسرت لے کر رخصت ہوتی ہے۔ ؎

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

---

[۱] سوشلسٹ موومنٹ از آرتھر شیڈویل۔ حصہ دوم۔ ص ۲۳ تا ۲۵۔

روسی قوم کا پنپنا اصل میں زار روس کے خاندان کا مٹنا تھا۔ اس انقلاب سے پہلے یہ شاہی خاندان آسمان سے ٹکر لیتا اور ساری دنیا پر منہ آتا تھا۔ اس خاندان کی حکومت اس قدر ظالمانہ اور استبدادانہ تھی کہ کوئی قوم بھی اسکی روباہ بازی سے نہ بچ سکی۔ یہ حکومت ترکی کا گلہ اس لئے دبائے رکھتی کہ وہاں صلاح الدین ایسا کوئی اور سورما سپاہی پیدا ہو کر اُسے ترکی بہ ترکی جواب نہ دے۔ وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتی۔ کہ جب موقعہ ملے۔ ترکی کے پر کتر دیئے جائیں۔ تاکہ وہ ادھر اُدھر نہ ہو سکے وہ ایران سے اس لئے تنی رہتی کہ ایرانی قوم کسی وقت سلجھ کر اُس سے نہ اُلجھے یہ تو تھے اس کے اس وقت کے ہتھکنڈے۔ جبکہ اس کا ستارہ اقبال بلندی پر تھا۔ مگر جب اس خاندان کی تباہی کا وقت آیا۔ تو پھر اُسے دم لینے کی بھی فرصت نہ ملی۔ اور قوم نے اپنی بھلائی اسی میں دیکھی۔ کہ یہ خزینہ شر جس قدر جلدی ہو سکے زیر زمین دفن کر دیا جائے۔ اس خاندان کی تباہی کا حال زار پڑھ پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ کہ یہ سارے کا سارا گھر کس طرح دیکھتے دیکھتے شہر خموشاں میں جا بسا۔ امیر ؎

آئینہ ہے پیش نظر عبرت سے دیکھ اے بے خبر
بزم خموشاں بھی ادھر ہے عیش کی محفل کے پاس

اللہ کی شان! اس عالی نژاد خاندان پر جو کسی وقت سارے یورپ کی آنکھوں کا تارا اور انجمن انجم میں مہ پارہ تھا۔ ایک وقت ایسی بیکسی چھائی کہ کوئی اُس کی

بات نہ پوچھنا تھا۔ حیات کے آخری لمحوں میں اس کا مسکن گورِ غریباں سے بھی بدتر تھا۔ جہاں ہنسنے کو کوئی پھول تھا۔ نہ رونے کو شمع۔ امیر ؎

گھر میرا گورِ غریباں سے بھی بڑھ کر ہے خراب
گل کو ہنستے نہ یہاں شمع کو روتے دیکھا

روس کا یہ شاہی گلزار، نہیں نہیں۔ سارے ملک کا یہ لالہ زار اس وقت تک پھلتا پھولتا۔ اور رنگ پکڑتا رہا۔ جب تک کہ اس کا سینہ دوسروں کی ہمدردی میں داغ داغ رہا۔ لیکن جونہی کہ اُسکے ذہن سے انسانی ہمدردی کا خیال اُترا اور اُسکے دماغ میں غرور کی ہوا سما گئی۔ تو پھر اس پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ اور اُسے اپنے بیگانے سے غیریت کی بُو آنا شروع ہوئی پس یہی وقت تھا جبکہ وہ خود بوئے گل بن کر صحنِ چمن سے اُڑ گیا۔ امیر ؎

رنگِ گل ہو کے چمن میں رہیئے
بُوئے گل ہو کے نہ اڑ جائیے گا

اب اس بلند اختر خاندان کا ستارۂ اقبال غروب ہو رہا تھا۔ اس پر اب وہ نازک وقت آگیا تھا۔ جو اس سے پہلے اسی قسم کے گھرانوں پر آتا رہا۔ دنیا میں شاہی خاندانوں کی صلاح و بہتری دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ بلا امتیاز مذہب و ملت خلقِ خدا کی خیرخواہی میں جان لڑا دیں۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے پروردگار سے منہ موڑ کر خواہ مخواہ روں کی نہ لیں۔ یہ دونو باتیں اب اس شاہی خاندان کے

افراد سے عنقا ہوئی جاتی تھیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ کفر و دین اور اسلام و عیسائیت کو ایک آنکھ سے دیکھتے۔ اور کعبہ و دیر کو ایک جیسا منظر حق سمجھتے۔

امیر ؎

کبھی کعبے میں صرف سجود ہو کبھی دیر میں جا کے حرم سے ٹھہر
رہے دین میں کفر بھی مدنظر نہ صنم سے بگڑ نہ خدا سے بگڑ

مگر اب تو وہ سب عصبیت کی پیٹھ ٹھونک کر اپنی رعایا کے مختلف فرقوں میں منافرت کی ایک دیوار کھڑی کئے جا رہے تھے۔ مگر ان کو خبر نہ تھی کہ وہ خود ایک وقت اسی دیوار میں چن دیئے جائینگے۔ امیر ؎

آئے بیٹھے اُٹھ گئے کتنے حسیں لیکن امیر
شکل آئینہ میں اس محفل میں حیراں رہگیا

امیر طبقہ کا غریب طبقہ پر ظلم و ستم زیادہ تر کثرت سیم و زر اور فراوانی سرمایہ کا نتیجہ ہے۔ اِس فراوانی کے اس طرح کے نتائج قریباً قریباً ہر ملک میں کم و بیش پیدا ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ سوئیزرلینڈ۔ جرمنی۔ ڈنمارک۔ سویڈن۔ ناروے۔ بلجیم۔ آسٹریا۔ ہالینڈ۔ فنلینڈ۔ آسٹریلیا۔ امریکہ۔ وغیرہ وغیرہ میں امیر طبقہ سے تنگ آکر غریب طبقہ کی جماعت کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوئیزرلینڈ میں ۱۸۷۰ء میں سوشل ڈموکریٹک پارٹی عالم وجود میں آئی۔ اِسی نام کی ایک جماعت ۱۸۷۵ء میں ڈنمارک میں ۱۸۸۳ء میں سویڈن

میں پیدا ہوئی۔ ۱۸۸۵ء میں بلجیم میں بھی لیبر پارٹی کا ظہور ہوا۔ آسٹریا میں بھی ۱۸۹۲ء
میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی قایم ہوئی۔ ہالینڈ میں بھی ۱۸۹۴ء میں ڈیموکریٹک لیبر
پارٹی بنی۔ آسٹریا میں بھی ۱۸۸۷ء میں سوشلسٹ تحریک منظر تاباں پہ آئی۔ اور
۱۸۹۰ء میں بھیڈ بکری پالنے والوں نے سرمایہ داروں اور مالکان اراضی کے خلاف
سٹرائیکیں کیں۔ اور یہاں بھی امیر جماعت کا کھیل بگڑ گیا۔ اور ایک لیبر پارٹی وجود
میں آئی۔ امریکہ سب سے بڑھکر سرمایہ داری اور بڑی سلجھی ہوئی صنعت و حرفت کا
گھر ہے۔ مگر چونکہ یہاں کی حکومت جمہوری ہے۔ اور یہاں کے امیر لوگ بھی خود
محنت کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ اس لئے امیر طبقہ کا غریب طبقہ پر یہاں
چنداں ظلم نہیں۔ پھر بھی چونکہ یہاں بھی امارت اور غربت کی کچھ نہ کچھ باہمی رقابت
موجود ہے۔ اس لئے یہاں بھی اتنا ہوا کہ مختلف وقتوں پر مختلف پارٹیاں قائم
ہوتی رہیں۔ اور طبقہ غرباء کے آڑے آتی رہیں۔ ۱۸۷۶ء میں لیبر پارٹی قائم
ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں سوشلسٹ پارٹی وجود میں آئی۔ اس کے بعد "امریکن فیڈریشن
آف لیبر" اور "انڈسٹریل ورکرز آف دی ورلڈ" قائم ہوئی۔

یہ تحریک جرمنی میں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئی۔ کیونکہ کرل مارکس جو اس تحریک
کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی سال نمودار ہوا۔ مارکس کا معاشرتی فلسفہ خاص طور
قابل ذکر ہے۔ اس کا سوشلزم سائنٹیفکسٹ کہلاتا ہے۔ اس کی تحریک کا اصولی
نظریہ یہ ہے کہ اقتصادی پیداوار اور مبادلہ کے مروجہ طریق اور معاشرتی تنظیم پر

ہی ہر دور کی سیاسی اور عقلانی تاریخ بنی ہے۔ اس لئے اس کی نظر میں تاریخ عالم گویا تاریخ ہے۔ اس رقابت اور تنازعہ کی جو حاکم و محکوم اور سرمایہ دار و مزدور کے درمیان برپا ہے۔ یہ تاریخ کا مادی نظریہ ہے۔ اس کا تجزیہ ذیل کے مقدمات میں کیا جا سکتا ہے :۔

(الف) تاریخ طبقہ دارانہ معاشرتی ارتقاء کا ایک عمل ہے۔

(ب) ہر طبقے کے اپنے مادی حالات ہوتے ہیں۔ اور اُن حالات سے اسکا نظام معاشرت نیا رہوتا ہے۔

(ج) اقتصادی نظام یا دوسرے لفظوں میں پیداوار کے طریق کار سے سوسایٹی مختلف جماعتوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور یہ سرمایہ دار، مزدور پیشہ حاکم اور محکوم جماعتیں ہوتی ہیں۔

(د) سوسایٹی کا ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں جانا نتیجہ اسی تنازعہ فرقہ دارانہ کا ہے۔

مارکس کے نزدیک محنت ہی تمام چیزوں کی اصلی قیمت ہے۔ کرایہ، سود اور نفع اشیاء فروختنی کی محنت زائدہ کے مختلف اجزاء ہیں۔ اس لئے مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص کو محنت کے تناسب سے قیمت اشیاء ملنا چاہئے۔ لیکن اس کا نظریہ بھی نقائص سے خالی نہیں۔ بہرحال جرمن میں جو سوشل تحریک پیدا ہوئی۔ اس نے ترقی کر کے اپنا یہ پروگرام مرتب کیا۔

(۱) ہر ۲۱ سالہ مرد یا عورت حق ووٹ کا رکھتا ہے۔
(۲) ہر ایک بالغ عاقل سے کچھ نہ کچھ فوجی خدمت لی جائے۔
(۳) جنگ اور امن وامان کے بارہ میں نمایندگان قوم کا فیصلہ ناطق ہو۔
(۴) انعقاد جلسہ اور تقریر کی آزادی ہو۔
(۵) مرد اور عورت ہر طرح برابر ہوں۔
(۶) مذہب صرف نج کی بات سمجھی جائے۔
(۷) پبلک کا روپیہ کسی مذہبی کام پر نہ لگے۔
(۸) تعلیم عام ہو۔
(۹) جج بذریعہ انتخاب لئے جائیں۔
(۱۰) دادگستری مفت ہو۔
(۱۱) حکم سزا سے مرافعہ کی اجازت ہو۔
(۱۲) طبی علاج اور تجہیز و تکفین مفت ہو۔
(۱۳) انکم ٹیکس معمولی ہو۔
(۱۴) مزدوروں کے متعلق خاص قوانین وضع کئے جائیں مثلاً مزدور سے آٹھ گھنٹہ سے زیادہ کام اور چودہ ۱۴ سال سے کم عمر کے لڑکے لڑکی سے جسمانی محنت نہ لی جائے۔ رات کے وقت کام نہ لیا جائے۔ ایک ہفتہ میں کم از کم چھتیس ۳۶ گھنٹہ آرام کے لئے ہوں۔

(۱۵) کاشتکاروں اور خانگی ملازموں کو مزدوروں کے حقوق دیئے جائیں۔
اس پروگرام کے ملاحظہ سے یہ بات ٹپک رہی ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح جرمن میں بھی اس تحریک کے دو پہلو تھے۔ ایک اقتصادی اور دوسرا سیاسی[1]۔
ٹرکی میں ۱۹۰۸ء میں اور جنگ عظیم کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی اسی تحریک کی ایک صورت تھی۔ سلطان عبد الحمید ۱۸۷۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت ملک کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ملک کے اندر لوگوں پر مایوسی اور ناامیدی چھائی ہوئی تھی اور ان کی اقتصادی اور معاشرتی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ ملک کے باہر حکومت کو ناکامی پر ناکامی ہو رہی تھی۔ آخر ۱۸۷۶ء میں کسی نہ کسی طرح پارلیمنٹ بنی۔ اور سلطان نے آئینی حکومت کا اعلان کیا۔ ابھی اس حکومت کے قدم بھی نہ ٹکے تھے۔ کہ روس کے ساتھ ٹرکی کی لڑائی چھڑ گئی۔ اور پارلیمنٹ ہمیشہ کے لئے برطرف کر دی گئی۔ اس سے حکومت ملکی بد سے بدتر ہو گئی۔ ٹرکی میں اس وقت نوجوان ترکوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو چکی تھی۔ جس کی رگوں میں قومی خیر خواہی کا خون جوش مار رہا تھا۔ اس جماعت کا نصب العین یہ تھا کہ ملک میں سیاسی اور اقتصادی انقلاب پیدا کیا جائے۔ سلطان اپنا زور بڑھانا چاہتا تھا اور یہ جماعت اُسے گھٹانا چاہتی تھی۔ اس لئے ان دونوں کی اندر اندر خوب چلتی رہی۔ یہاں تک کہ

---

[1] Socialist Movement by A. Shadwell Part I PP 47 to 68

انکی باہمی رقابت نے ایک خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ سلطان نے اپنا اقتدار
بڑھانے اور دشمنوں کی خبر رکھنے کو جاسوسوں کی ایک کثیر جماعت مقرر کر رکھی تھی۔ جو
اب چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس جماعت پر ملک کا قریباً تین ملین پونڈ سالانہ
خرچ اٹھتا تھا۔ یہ تو کاغذات کے رُو سے تھا۔ اور جو کچھ اُن کو چوری چھپے سے ملتا۔
اُس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسکے علاوہ حکومت اب اپنی غرض پوری کرنے کے لئے
اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئی تھی۔ سلطان کی ناقدر شناسی دیکھیئے کہ دس سال کے
عرصہ میں دس ہزار جانثار ترک صرف سیاسی جرائم کی پاداش میں موت کے گھاٹ
اتار دیئے گئے۔ اور لائق اور قابل افراد صرف اپنی قابلیت اور حریت پسندی کے
سبب سالہا سال کے لئے جلاوطن کر دیئے گئے۔ تجارت کی آزادی، تقریر و تحریر
کی آزادی اور حکومت کی آزادی پر گفتگو کرنا یا لکچر دینا مقرر کے قید یا جلاوطن کیئے
جانے کو کافی تھا۔ آئینی قانون پر کسی شخص کو لکچر دینے کی اصلاً اجازت نہ تھی۔ بلکہ
یونیورسٹی کے ان پروفیسروں کو بھی موقوف کر دیا جاتا۔ جو آزادیٔ تجارت اور
آئینی قانون پر لکچر دیتے تھے۔ اس لئے سلطان کی حکومت ظالمانہ بھی تھی۔ اور
احمقانہ بھی۔ اُسکے منظور نظران پڑھ لوگ۔ مغربی ممالک میں سفرا در بار مقرر کر دیئے
جاتے۔ شاہی محلات اُس کی اپنی جماعت کے آدمیوں سے بھرے پڑے تھے
ان لوگوں کے لئے سرکاری روپیہ بے دردی سے خرچ کیا جاتا۔ یہ لوگ عیش و عشرت
کی زندگی بسر کرتے اور سلطان کے اشارے پر حریت پسند لوگوں کو قتل کر دینے پر

تلے رہتے تھے۔ تلے کیوں نہ رہتے جب انہیں اپنے آقائے نامدار کی خاطر ہر طرح منظور تھی۔ اور پھر آقا بھی ایسا کہ اس وقت دنیا میں اس کا کوئی جواب تھا نہ غم۔ ع

کب میسّر ہو روزگار ایسا اور آقائے نامدار ایسا

پرانے اور گئے گذرے جہازوں پر جن کی مشینری بھی قابل کار نہ رہی تھی۔ اور جو بندرگاہوں سے باہر بھی نہ جا سکتے تھے۔ سلطان نے کئی ہزار بحری افسر مقرر کر رکھے تھے۔ اور یہ سب کے سب وہی لوگ تھے۔ جو اس سے پیمان اطاعت باندھ چکے تھے۔ اور اس کے حکم سے بال بھر ادھر ادھر نہ ہو سکتے تھے۔ ان دنوں کاشتکاروں کی جان پر بھی بن آئی تھی۔ اب مالکان اراضی کا ظلم و ستم بھی اُن پر کچھ کم نہ تھا۔ کاشتکاروں سے پے درپے کئی دفعہ ٹیکس اور لگان وصول کرتے۔ اور اس وصولی میں بڑی بے رحمی سے کام لیتے۔ فوج کا دم بھی ناک میں آگیا تھا۔ سپاہیوں کی تنخواہیں کئی کئی ماہ بند پڑی رہتیں۔ اور وہ اپنا خرچ پورا کرنے کو لوٹ مار اور مار دھاڑ پر بھی اُتر آتے تھے۔ ان حالات میں لوگوں کا اعتقاد شہنشاہیت سے بالکل اٹھ گیا تھا اور وہ کہنے لگے تھے۔ کہ ان سب تکلیفوں کا باعث صرف سلطان کا ناپاک وجود ہے جو اپنی رٹ لگائے جاتا اور رعایا سے مشورہ کئے بغیر حکومت کئے جاتا ہے سلطان شخصیت کا دلدادہ اور جمہوریت کا جانی دشمن تھا۔ اسکی یہ دلدادگی اور دشمنی رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ اُن دنوں مقدونیہ کی حالت بہت ابتر ہو چلی تھی۔ وہاں مالکان اراضی کا ظلم کاشتکاروں پر حد سے گذر گیا تھا۔ اور کاشتکاروں نے زمینیں

کاشت کرنی چھوڑ دی تھیں۔ اِس لئے وہاں بہت سی زمینیں غیر آباد اور ویران پڑی تھیں۔ اشیار کی قیمتیں بھی چڑھ رہی تھیں۔ قحط کی بھیانک صورت نظر آ رہی تھی۔ اور تباہی کے تمام آثار پیدا تھے۔ لوگ وطن چھوڑے جاتے تھے۔ قتل و غارت کی گرم بازاری ہو رہی تھی۔ عین اِس بڑے موقعہ پر شہنشاہیت کے خلاف ایک خفیہ جماعت قائم ہوئی جس کا منتہائے نظر سیاسی اور اقتصادی انقلاب پیدا کرنا تھا۔ اِس کے سرگرم کارکن الوزبے اور نیازی تھے۔ سلطان کی بھی اِس جماعت پر نظر تھی۔ اور اس نے اِس کے گرم کارکنوں پر ڈورے ڈالنے بھی شروع کر دیئے تھے انہیں دنوں سلطان کی طرف سے الوزبے کو پیغام ملا۔ کہ ہمارے پاس آؤ۔ تمہیں منصب عالی پر سرفراز کیا جائے گا۔ سلطان اُسے ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ وہ بھی سلطان کی نیت تاڑ گیا۔ وہ راہ کاٹ کے کوہ جبل کی وادیوں میں نکل گیا اور بھیس بدل کر دہقانوں میں پھرتا پھرانا اور تحریک آزادی کی اشاعت کرتا رہا۔ اِن دونو نے سپاہیوں اور فوجی افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اِس کے علاوہ عوام الناس اور البانیہ کی قریباً ساری آبادی اُن کے ساتھ ہولی۔ آخر ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو "کمیٹی آف یونین اینڈ پراگریس" کی طرف سے سلطان کو یہ الٹیمیٹم دیا گیا۔ کہ اگر چوبیس ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر آئینی حکومت کا اعلان نہ کیا گیا۔ تو قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ سلطان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ قوم اب آئیں بائیں بتانے سے نہیں پرچ سکتی۔ اور نہ مرغ وحشی منتر پھونکنے سے

دام میں آسکتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے وزیروں سے مشورہ کرکے اس جماعت
کے آگے سرتسلیم خم کرکے ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کے سرکاری گزٹ میں آئینی حکومت
کا اعلان کردیا۔ نوجوان ترکی پارٹی کے ارکان کو سلطان کے آیندہ رویہ کی نسبت
ابھی کچھ کھٹکا باقی تھا۔ مگر سلطان نے آئینی حکومت کے پروگرام پر دستخط بھی کردیئے
اور اس پر عمل کرنے کے لئے حلف بھی اٹھالیا۔ اسی دن سلطان کی اپنی جماعت
کے افسر برطرف کردیئے گئے۔ جلاوطن کئے ہوئے اشخاص واپس بلائے گئے
اور پولیٹیکل قیدی چھوڑدیئے گئے۔ اس دن سے ٹرکی کی سیاسی اور اقتصادی حالت
روبہ ترقی ہوئی۔ پارلیمنٹری حکومت کے قائم ہونے کے باوجود بھی سلطان کو حکومت
میں بڑا دخل تھا۔ اور نوجوان پارٹی کو سلطان کا یہ اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔
آخر اس پارٹی کے زور پکڑنے پر سلطان معزول کردیا گیا۔ اور اسکی جگہ دوسرا
سلطان بنایا گیا۔ اس کے بعد گذشتہ جنگ عظیم شروع ہوئی جس میں ٹرکی
نے جرمن کا ساتھ دیا۔ اور جب جرمنی کو شکست ہوئی۔ تو ٹرکی بھی اتحادیوں کے
نرغہ میں آگئی قسطنطنیہ پر اتحادی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ اور سلطان دوسروں کے ہاتھ
میں کٹھ پتلی بن گیا۔ اب ترکی ان لوگوں کے لئے منہ کا نوالہ تھی۔ وہ تو پہلے ہی سے
دم توڑ رہی اور ادبار کی گود میں ہمک رہی تھی۔ اس پر فرانس واٹلی کی یہ نیت کہ
اُسے ایسا دبایا جائے۔ کہ پھر اُکسنے کا نام نہ لے۔ یہ دیکھ کے غیور ترکوں کی آنکھوں
میں خون اتر آیا۔ فتح ونصرت تو اب اُنکے قدم چومنے کو تھی۔ اور ساتھ ہی اُن کو یہ

خیال بھی تھا کہ وہ میدان میں تن تنہا نہیں۔ بلکہ تمام قوم کی جانیں اُن سے لپٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے اِن مٹھی بھر آدمیوں نے ملکی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بلند کیا کیا کہ ترک ٹڈیوں کی طرح زمین سے اُمڈے چلے آتے۔ اور انہوں نے اتحادیوں کو قسطنطنیہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یونانیوں کو تھریس سے مار بھگایا۔ اور سلطان وقت کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت سے ٹرکی میں موجودہ جمہوریت کی بنیاد پڑی اور قوم کی اقتصادی اور سیاسی حیات میں وہ تغیر ہوا کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ گویا ان چند سالوں میں اتنا ہو گیا ہے کہ ایک ٹرکی جسے یورپ نے "مرد بیمار" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اب یورپ کا "جوانمرد" مانا جاتا اور یورپ کی ایک طاقت گنا جاتا ہے[۱]۔

اے ٹرکی! اب تو کیا سے کیا ہو گئی۔ خدا کی شان! تو خود مسافر بنی اور خود رہبر تو زندہ رہی اور منزل مقصود کو پہنچی۔ امیر ؎

خضر رہِ مقصود اگر دل نہیں ہوتا
منزل کا پتہ سینکڑوں منزل نہیں ہوتا
وہ ہم ہیں کہ زندہ ہیں اور اس کوچہ میں پہنچے
بے موت کوئی خاک میں داخل نہیں ہوتا

اے ٹرکی! کیا ہوتے وہ دن جب کہ تو دلہن بنی رہی۔ اور سارے یورپ پر چھائی رہی!

---

[۱] دیکھو تاریخ ٹرکی حال ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۴۔

وہ دن تیرے سہاگ کے تھے۔ اُن دنوں تو نازونعم کی گود میں کھیلتی اور خواب غفلت میں اونگھتی رہی۔ اِن دنوں تیرے چمن میں طرح طرح کے پھول مہکے۔ جنھوں نے تیرے درو دیوار کو مہکا دیا۔ تیرے پھولوں کی لہک تیری کیاریوں کی مہک۔ تیرے پکھیروؤں کی چہک اور تیرے لالہ رخوں کی دمک نے تیرے سارے چمن کو فردوس بریں بنا دیا تھا۔ اور تیری کائنات کا ذرہ ذرہ آفتاب سے ہمسری کرتا تھا۔ اُس وقت تو آرزو سے کمال میں ایسی مست ہو چکی تھی۔ کہ تیری شبنم کا قطرہ قطرہ آفتاب بن رہا تھا۔ ع

شبنم بآفتاب رسید آفتاب شد

اے عالی نژاد ٹرکی! اے یورپ کی جان ٹرکی! یہ وقت وہ تھا جبکہ تیرے عروج کا آفتاب اوج کمال پر پہونچ چکا اور حضیض زوال کے قریب ہو چکا تھا کیا تجھے خبر نہ تھی۔ کہ ہر لقا سے فنا ملی ہوتی ہے۔ اور ہر حیات میں ممات چھپی ہوتی ہے؟ کیا تو جانتی نہ تھی۔ کہ غالب سے

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اِن دنوں کے بعد جب تیرے ادبار کی راتیں آئیں۔ تو تیرا سہاگ چھن گیا۔ اور تجھ پر مصائب کی گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم کر برسیں۔ تو دن بدن اپنے ہی غم میں گھلے اور گھٹے جاتی تھی اور تیرے لخت جگر ہی تجھے تیرے دشمنوں کے

ہاتھ پیچ ڈالتے رہے۔ اور تجھ پر وہ ظلم توڑتے رہے ہے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اِس وقت موت تیرے سر پر کھیل رہی تھی۔ اور تیرے خیر خواہ جان جوکھوں میں پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ تیری آرزوؤں پر اوس پڑ رہی اور تیرے ڈھدڈھاتے ہوئے نونہال اور لہلہاتے ہوئے پودے ٹوٹ رہے تھے۔ گویا کہ اِس وقت تیری کائنات کا ذرہ ذرہ فنا کی آغوش میں تھا۔ تیری بزم میں جہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اب ایک ہو کا عالم تھا۔ تیری شمعیں بجھ چکیں۔ اور تیری محفل اکھڑ چکی تھی۔ تیرے چمن اجڑ چکے۔ اور تیرے پھول مرجھا چکے تھے۔ مگر ہاں ہاں ایک بات اب بھی ضرور تھی۔ تیری بجھی ہوئی شمعیں ابھی تک دُود بداماں اور تیرے مرجھائے ہوئے پھول زر بکف تھے۔ یعنی کہ ابھی تک تیرے جسم میں سدّ رمق باقی تھی۔ کہ تیرا ایک سپوت تیری مدد کو آن پہنچا۔ اور اُس نے تیری مردہ شمع کو جلا کر اور اُس سے آگ سلگا کر تیرے تن بدن میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اور اُس نے تیرے ہی پھولوں سے تیرے چمن میں از سرِ نو بیج بو کر تیرے اجڑے چمن کو گلزارِ ارم بنا دیا اب تو سے

قہقہے اڑتے ہیں جمگھٹ ہیں پریزادوں کے
میلے ہر روز ہوا کرتے ہیں آزادوں کے

فرانس اور اٹلی آجکل کیا کرتے ہیں۔ اگر ان کی موجودہ رفتار سرمایہ داری اور استعمار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جبکہ ان کی دولت پر جھاڑو پھر جائے گا۔ اور وہ ادبار

کے اندھے کنوئیں میں گر کر اپنی امارت کو ہمیشہ کے لئے رو بیٹھیں گی۔ ان کا جہاں کہیں داؤ چلتا ہے۔ اپنی استعمار کا جھنڈا گاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شام طرابلس وغیرہ میں انکے استعمار کا نال گڑا ہے۔

یہ تو سب کچھ ہے۔ مگر پھر بھی ایک بات ضرور ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا کی رونق ان قوموں کے دم قدم سے ہی ہے۔ اگر ایک طرف ملوکیت اور جبر و استبداد ہے۔ تو دوسری طرف مسکنت اور حریت و مساوات ہے۔ اگر ان متضاد قوتوں میں سے کوئی ایک بھی مٹ جائے۔ تو پھر اس دنیا کی رونق بھی ختم ہے۔ اور یہاں لطافت ہے نہ کثافت۔ اور نور ہے نہ ظلمت۔ غالب ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

امیر ؎

گل تھے بلبل کے لئے سرو تھے قمری کے لئے
کوئی شئے گلشن ایجاد میں بیکار نہ تھی

دنیا کی ان مقتدر قوموں کی داستانیں بہت لمبی ہیں۔ انکی ملی حیات کے کارناموں پر مختصر سے مختصر الفاظ میں دھندلی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناظرین کرام خود تاریخ اقوام کا مطالعہ کریں اور دیکھیں۔ کہ کس طرح ہر دور انحطاط میں تحریک ملی ایک نہ ایک رنگ میں رونما ہوئی۔ اور اس نے کیونکر قوموں کی کایا پلٹ دی۔

مختلف قوموں کی اپنے افراد کے ساتھ جو بے انصافی ہوتی رہی۔ اس کی جستہ جستہ داستانیں بھی اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔ اور اُس سے جو اضطراب اور بے چینی پھیلتی رہی۔ اُسکا بھی ذکر ہوا۔ آج بھی ہر جگہ بے چینی ہی بے چینی نظر آتی ہے۔ جدھر دیکھو ہی جھگڑا نظر آرہا ہے۔ کہ کیوں قوم کے سب افراد کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ امریکہ۔ انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس۔ سپین۔ یونان۔ اٹلی وغیرہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو کسی حد تک احاطہ اعتدال کے اندر ہے۔ مگر جو کچھ روس میں ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ وہ کہیں بھی سرمایہ دار ملکوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم عام اور جبری ہونی چاہیئے۔ یہ تعلیم قریباً سب مہذب ملکوں میں جبری ہی ہے۔ اور ایسے ہی روس اور انگلستان میں بھی ہے۔ مگر یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ کہ مذہب کا نام و نشان ہی روئے زمین سے مٹا دیا جائے۔ اس وقت روس میں جس پیمانہ پر مذہب کے خلاف جہاد ہو رہا ہے۔ اگر وہ درست ہے تو وہ ملک کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ مذہب کے خلاف اس قدر مظاہرہ اور عملی اقدام قوم کو ایک نہ ایک وقت رسوائے عالم کر کے رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ جس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہوں وہاں مذہب کو سیاست کے اندر داخل نہ ہونے دینا چاہیئے۔ اور اُسے نجی بات سمجھنا چاہیئے۔ مگر یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ کہ مذہب کو سرے سے ہی مٹا دیا جائے۔ اسلئے روسیوں کو مذہب کے متعلق اپنا زاویہ نگاہ بدلنا چاہیئے۔

ورنہ اس سے حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہوجائیں گی۔ روسیوں کے دستور العمل میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ملک کی ساری ارضی جائیداد جو افراد کے ہاتھ میں ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں رہے اور اسکی آمدنی سرکاری خزانہ میں داخل ہو۔ اس سے بھی ایک طرح سے مذہب پر ہی زد پڑتی ہے۔ کیونکہ اس سے قانون وراثت کا نام ونشان ہی نہیں رہتا۔ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ سب جاگیرات واپس لے لے۔ گوکہ بلا امتیاز نیک وبد ایسا کرنا بھی ایک حد تک معیوب ہوگا۔ لیکن اگر حکومت کو ایسا کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ تو وہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ مگر حکومت کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہے۔ کہ وہ شخصی جائیدادوں پر بھی اندھا دھند قبضہ جمالے اس قسم کا دستور العمل کسی مہذب ملک میں مطلق طور رائج نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں رائج ہے۔ روسیوں نے اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے بنک کے سرمایہ کو بھی حکومت کے سرمایہ میں شامل کر لیا ہے۔ قوم بے شک اپنے ملک کے اندر کارخانوں فیکٹریوں اور پیداوار کے آلات کا جال بچھا سکتی ہے۔ مگر نہ اس طرح کہ ہر طرح کی شخصی جائیدادوں اور انفرادی کارخانوں پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ روس میں اسوقت کیا ہو رہا ہے۔ وہاں زرعی اور تجارتی پیداوار اور باربرداری کے تمام ذرائع قوم کے ہاتھ میں ہیں۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جبکہ قوم کے تمام افراد اپنی مرضی سے اپنی ذاتی ملکیت قوم کے حوالہ کردیں۔ نہ یہ کہ قوم خود بخود اُن پر قابض ہوجائے اس میں شک نہیں کہ اگر تمام زرعی زمین حکومت کے ہاتھ میں ہو تو اس سے

ایک بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ قوم کم سے کم خرچ سے بڑے سے بڑے پیمانہ پر کاشت اجتماعی کا انتظام کر سکتی اور اچھی سے اچھی پیداوار نکال سکتی ہے جیساکہ اس وقت امریکہ اور آسٹریلیا و روس میں ہو رہا ہے۔ مگر یہ بھی اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ ساری قوم متفق و متحد ہو۔ البتہ روس اور دیگر مہذب ملکوں میں ایک بات جو نہایت عمدہ ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ شہر اور گاؤں کا امتیاز آہستہ آہستہ مٹایا جا رہا ہے۔ اس سے دیہات کا تعمیری کام خود بخود سرانجام پاتا اور دیہاتی زندگی کو بے حد فایدہ پہنچتا ہے۔ شہر تہذیب و تمدن کا مرکز ہوتے ہیں۔ جہاں سلجھے ہوئے لوگ رہتے ہیں۔ قوم کی ترقی زیادہ تر دیہات سے وابستہ ہوتی ہے اور وہی قوم ترقی کی دوڑ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ جو دیہات میں روشنی پھیلا کر دیہاتیوں کی زندگی سلجھائے۔ اس قسم کا کام سب مہذب ملکوں میں کم و بیش ہو رہا ہے۔ ہندوستان اس بات میں بھی سب سے پیچھے ہے۔ یہاں دیہات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ہمارا یہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ دیہاتی زندگی میں اصلاح کی لہر نہ دوڑے۔ اور یہ کام حاکم و محکوم دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ روس اور دیگر مہذب ملکوں میں ایک بات جو سب باتوں سے بڑھکر ہے وہ یہ ہے کہ دادگستری مفت ہے۔ نہ کوئی کورٹ فیس ہے۔ نہ کوئی اسٹامپ انعقاد جلسہ اور تقریر کی آزادی تو اب ہر جگہ ہے۔ یہاں تک کہ اب ہندوستان میں بھی یہ آزادی کچھ نہ کچھ دی جا رہی ہے۔ اس لئے ہر مہذب قوم کو کسی نظام حکومت

کے نفاذ سے پہلے امور ذیل پر غور کر لینا چاہیئے۔

اوّل۔ کیا مناسب ہے کہ جایداد ارضی اور ہر قسم کا سرمایہ افراد کے قبضہ سے نکل کر قوم کے قبضہ اجتماعی میں آنا چاہیئے۔

دوئم۔ کیا قانون وراثت ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور ایسا کرنے میں کیا کیا نقصان اور کیا کیا فائدہ ہے۔

سوئم۔ کیا جمہوری نظام کے جاری ہوتے ہوئے بھی شخصی جائدادوں کی حفاظت ہوتی ہے۔

چہارم۔ کیا ابتدائی تعلیم لازمی کی جا سکتی ہے۔

پنجم۔ کیا سب افراد سے جبریہ محنت اور فوجی خدمت لی جا سکتی ہے۔

ششم۔ کیا زراعت کا کام اجتماعی طور پر انجام پذیر ہو سکتا ہے۔

ہفتم۔ کیا سب افراد ذکور واناث سے برابر کا سلوک ہو سکتا ہے۔

اِن امور کے متعلق ہر قوم کا زاویہ نگاہ مختلف ہوگا۔ اور اس زاویہ نگاہ کو اسکے نظام حکومت اور اسکے اقتصاد سے بھی گہرا تعلق ہوگا۔ اِس لیئے اِن امور کا فیصلہ ہر قوم اپنے اندرونی حالات اور اپنے ماحول کی بنا پر کریگی۔ البتہ مساوات کا مسئلہ ایسا ہے جس کا سب سے ایک جیسا تعلق ہے۔ اِس لیئے اس پر کچھ مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مرد اور عورت کے اعضاء جسمی اور قوائے فطری اگر ایک جیسے ہوں۔ تو پھر کسی کو

بھی مساوات ذکور و اناث میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن اگر ایک جیسے نہ ہوں۔ تو وجہ
عدم مساوات کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ پہلے ہم اِن دونو کے اعضاء و قویٰ کی
طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ محقق متاخرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ عورت جسمانی
ساخت۔ طاقت اور قوتِ مقابلہ کے لحاظ سے مرد سے بہت پیچھے ہے۔ اور یہ
حقیقت اسکے تمام نظام جسمانی سے کھلتی ہے۔ عورت کا قد مرد کے قد سے عموماً
چھوٹا ہوتا ہے۔ عورت کا وزن بھی مرد کے وزن سے کم ہوتا ہے۔ عورت کی ہڈیاں
مرد کی ہڈیوں سے کمزور پائی گئی ہیں۔ اسکے عضلات بھی مرد کے عضلات سے
ضعیف ہوتے ہیں۔ اس کا دل بھی مرد کے دل سے ضعیف اور چھوٹا ہوتا ہے
عورت میں خون کی مقدار بھی مرد سے کم پائی جاتی ہے۔ پھر بھی عورت کی نبض
مرد کی نبض سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور یہ عورت کی کمزوری کی ایک دلیل ہے
عورت کا سینہ اور پھیپھڑا بھی اس قدر وسیع نہیں ہوتا جس قدر کہ مرد کا ہوتا ہے
عورت کی کھوپری مرد کی کھوپری سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اور اس میں مغز کی مقدار
بھی مرد کے مغز سے تھوڑی ہوتی ہے۔ مغز کے پیچ و خم قوت عقلیہ کا مرکز ہوتے
ہیں۔ مرد کے مغز کے پیچ و خم عورت کے مغز کے پیچ و خم سے کہیں زیادہ ہوتے
ہیں۔

عورت اور مرد کے فرائض میں بھی ایک اصولی فرق ہے۔ عورت کا اولین
فرض ماں بننا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی بہت سی کمزوریاں وابستہ ہیں۔ ایک تو

وہ اس ذمہ داری کی وجہ سے حمل کی تکلیفوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ اور مرد سے بہت پہلے طعمۂ اجل بنتی ہے۔ یا کمزور ہو جاتی ہے۔ اور قدم قدم پر اپنے خاوند کی محتاج رہتی ہے حمل کی حالت میں وہ ایسی بے بس ہوتی ہے۔ کہ معمولی جدوجہد سے بھی رہ جاتی ہے۔ اور ہر بات میں مرد سے سہارا لیتی ہے۔ ہکسلے کا قول ہے کہ "ماں بننا عورت کا خاصہ ہے اور یہ اسکے سر پر ایک بڑا بھاری بوجھ ہے۔ مرد کا یہ فرض ہے کہ اس بوجھ کو عورت کے سر سے ہلکا کرے۔ یا کم از کم اسکے ساتھ ایسا برتاؤ کرے کہ اس پر اور طرح کے بوجھ کی زیادتی نہ ہو۔ اور جو فطرت نے اس پر زیادتی کی ہے۔ اس میں اور اضافہ نہ ہونے پائے" [لہ]

ان جسمانی اور فطری کمزوریوں کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ عورت کے جذبات، احساسات اور اخلاق بھی مرد کے مقابلہ میں ضعیف و رکیک ہوتے ہیں۔ جسمانی کمزوری کے سبب سے عورت میں قوت احساس بڑھی ہوئی ہوتی ہے جس بات پر مرد کے کانوں پر جوں نہ رینگے۔ اس پر عورت چونک پڑتی ہے۔ اس میں مدح و ستایش اور حسد کا مادہ مرد سے بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا ارادہ مرد کے مقابلہ میں بہت کمزور ہوتا ہے۔ تنگ خیالی۔ تلوّن مزاجی۔ سخت گیری۔ کثرت کلامی اور نمایش حسن میں عورت مرد سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ حافظہ اور اجتہاد میں یہ مرد سے کمتر

لہ اس مضمون پر ایک علیحدہ کتاب فطرت نسوانی تالیف مولانا عبدالسلام ندوی موجود ہے۔

درجے پر ہے۔ البتہ اس کا احساس چونکہ قوی تر واقع ہوا ہے۔ اس لئے مرد سے کسی قدر ذہین ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ عورت کا رتبہ تمام باتوں میں مرد کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو مسلمانوں کی آسمانی کتاب میں مجمل طور یوں بیان کیا گیا ہے کہ ذکور کو اناث پر فضیلت کا ایک درجہ حاصل ہے۔ اگر مرد کو یہ ذرا سی فوقیت بھی حاصل نہ ہو تو پھر انتظام خانہ داری قائم رہ سکتا ہے۔ نہ عورت خاوند کے ساتھ نباہ کر سکتی ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ جس گھر کے دو مالک اور دو حاکم علی الاطلاق ہونگے۔ اسمیں کس قدر ابتری پھیلے گی۔ عورت ضعیف کمزور۔ نرم دل ہے اور جلد پھسلائی جا سکتی اور دھوکہ میں آسکتی ہے۔ اگر عورت پر مرد کا کچھ بھی اختیار نہ ہو۔ تو پھر سمجھو۔ کہ عورت کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ آج اگر وہ ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے پاس۔ مساوات کے اس برے نتیجے سے مغربی سوسائیٹی کے کچھ افراد اب حبالۂ ازدواج سے ہی فارغ ہوتے جاتے ہیں اور وہ نکاح کو اپنے لئے ایک مصیبت خیال کئے بیٹھے ہیں۔

اس لئے مناسب ہے کہ عورت کو ہر بات میں مرد کے مساوی نہ سمجھا جائے اب یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ عورت کو مرد کے ساتھ کن باتوں میں مساوات ہونا چاہئے۔ اور کن باتوں میں ایک کو دوسرے پر فوقیت۔ اب اگر صنف نازک

ہم سے تن جائے اور شکوہ و شکایت کی زبان کھولے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے
یہ معاملہ تقدیر کا ہے۔ اور تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی۔ جب خدا نے ہی اُسے
اس طرح کا بنایا اور اس کو مرد سے جدا رکھا۔ تو پھر اس میں شکوہ و شکایت بیجا۔
طعن و تشنیع بے محل ہے

ہم سے بے جا ہے تمہیں اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

ملکہ عسکریت کی ہمہ گیری

رومیوں کا فوجی نظام اور اسکی پختگی۔ سکندر اعظم کی فتوحات۔ پارتھیوں کا فوجی ولولہ۔ چنگیز خاں کے فوجی کارنامے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر اور خراسان کی تباہی۔ عثمانی سلطنت کی بنیاد۔ نپولین کی فوجی ذہنیت۔ اسلام کا عروج وزوال اور اسلامیوں کا جنگی جوش وخروش جاہلیت کے عربوں کا طرہ امتیاز۔ خلیفہ ثانی کا فوجی نظام۔

جس قوم کا فوجی ضبط و ربط کڑا اور نظام عسکریت بڑھا ہوا ہو گا۔ اس کا ستارہ اقبال بلندی پر ہو گا۔ عسکریت کا غم لینا قوم کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے قوم میں عسکری ذہنیت کا پیدا کرنا اور فوج کا بکھیڑا اٹھانا غم تو ہے۔ مگر یہ غم قوم

کے لئے عین راحتِ جان اور لقاءِ دل ہے۔

دُنیا کئی سو سال دور نکل آئی۔ مگر اب تک رومن قوم کا نام لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ صدیاں گذر گئیں۔ کہ تاریخ اس قوم کے کارنامے اپنی آغوش میں لے چکی۔ مگر اب تک قومی حمیت و غیرت اور عزت و عظمت اُس کی آستان کے مٹے ہوئے آثار پر سجدہ ریزی کر رہی ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ انکی فوجی ذہینت کا ڈنکہ صدیوں چار دانگ عالم میں بجتا رہا۔ اور ان کی عسکریت کا جھنڈا سالہا سال تک ربع مسکون کی بلندیوں پر لہراتا رہا۔ اس قوم کے فتوحات سات آٹھ سو سال تک جاری رہے۔ اور اس لئے اسکی سلطنت کا دامن چاروں طرف پھیلا۔ اس ممالکت کے غرب کو بحر اٹلانٹک۔ شمال کو دریار دینوب ورائین۔ شرق کو دریاء فرات۔ اور جنوب کو عرب وافریقہ کے ریگستان تھے۔ اس قوم کی فوجی طاقت کا رعب اقصائے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ یہ ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رہتی۔ اور اس تیاری کے بل پر اپنی وسیع فسیح سلطنت میں امن و امان قائم رکھتی تھی۔ آس پاس کی تمام قومیں اس کی جنگی طاقت کا لوہا مانتی تھیں۔ اور کسی کو اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ اُس کا نظام عسکریت اعلےٰ پیمانہ پر رہا۔ اور جونہی کہ اُس کا یہ نظام بگڑا تو اس کی عظمت و سطوت کا جنازہ بھی نکل گیا۔ اس کے فوجی نظام کی کچھ خصوصیتیں یہ تھیں کہ جو فوجیں دور دور ملکوں میں بھیجی جاتیں۔ وہ رومن شہریوں پر مشتمل ہوتیں۔ اور بھرتی

کے وقت عمر۔ قوت اور قد کا خاص لحاظ رکھا جاتا۔ اور اس بات کو بھی زیر نظر رکھا جاتا کہ جو بھرتی ہو وہ جنگجو قوموں سے ہو۔ اور فوجی افسر تعلیم و تربیت یافتہ اور خاندانی ہوں۔ جب کوئی سپاہی بھرتی کیا جاتا تو اس سے لڑائی میں پشت نہ دکھانے کا۔ افسروں کی تابعداری کا اور وقت پڑے پر جان تک نثار کر دینے کا حلف لیا جاتا۔ اِن دنوں اِس قوم میں اتحاد مذہبی اور عزت و حرمت قومی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اِس لیے اُس کی ساری کی ساری فوج ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی۔ اور ایک ہی خیال کے تار میں بندھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اِس پر تنخواہ کی باقاعدہ ادائیگی اور وقتی انعام و اکرام سونے پر سہاگہ کا کام دیتے تھے۔ بھگوڑوں کے لیے سخت سے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ فوج میں ٹریننگ اور ضبط و ربط کا خاص خیال رکھا جاتا۔ سپاہیوں کو صبح و شام فوجی ورزش کرائی جاتی۔ اور اِس ورزش کے جو آلات ہوتے۔ وہ لڑائی کے آلات سے کہیں بھاری ہوتے۔ فوج مارچ کرنا۔ دوڑنا۔ کودنا۔ تیرنا۔ بھاری بھاری بوجھ اُٹھانا۔ جنگی آلات کا کام میں لانا۔ باجے کی آواز پر حرکت کرنا اور طرح طرح کی ہیئتیں اختیار کرنا سیکھتی۔ اور مصنوعی جنگ کی نمایش کر کے یہ ثابت کر دیتی کہ ان کی مصنوعی اور اصلی جنگ میں صرف ریزشِ خون کا فرق ہے۔ شہنشاہ اِن وقت بھی خود سپاہیوں کے ساتھ انعامی مقابلوں میں شامل ہوتے۔ اور ناتجربہ کار سپاہیوں کو فوجی حرکت و سکون کے مناسب موقعوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

یہ فوجی نظام ضبط و ربط کا بہترین نمونہ تھا جس کی نظیر اُس وقت کی دوسری قوموں میں نہ ملتی تھی۔ رومیوں کا یہ نظام کوئی نو سو سال تک قائم رہا۔ اور اسیقدر عرصہ اُنکی فتوحات کا تانتا بھی بندھا رہا۔

انکی فوج بڑی منضبط تھی۔ پیدل فوج دس کوہرٹ اور پچیس کمپنیوں میں بٹی ہوتی تھی۔ پہلی کوہرٹ جس کے ساتھ قومی نشان شاہین کا لہراتا تھا۔ گیارہ سو پانچ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ باقی ہر ایک کوہرٹ پانچ سو پچپن سپاہیوں کی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کے آلاتِ جنگ اس وقت کے لحاظ سے نہایت موزون تھے۔ زرہ بکتر خود۔ زرہ سینہ۔ زرہ ساق۔ نیزہ۔ تلوار اور ایک نکیلا سا چھ فٹ لمبا ہتھیار جسکو وہ پیلم[^1] کہتے تھے۔ ہر ایک سپاہی کی شان بڑھاتے۔ ان کا رسالہ بھی بڑا منظم تھا جو دس دستوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ باقاعدہ فوج کے علاوہ عارضی فوج بھی ہوتی تھی۔ جب ان کو فوج میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑتی تو سرحدی اور بربر قوموں سے بھرتی کی جاتی۔ جہاں فوج کا کیمپ لگتا وہاں ایک عجیب منظر دکھائی دیتا۔ پیدل۔ سوار۔ عارضی فوج۔ سپاہی اور افسر اپنی اپنی جگہوں پر جم جاتے۔ اگر کیمپ کے اردگرد فصیل بنانی یا خندق کھودنی ہوتی۔ تو یہ کام بھی خود سپاہی ہی کرتے تھے۔

---

[^1]: Pelum

ہر ایک سپاہی کے ساتھ قلعہ بندی اور قلعہ کشائی کے مناسب اوزار اور کچھ دنوں کی ضروری رسد بھی ہوتی۔ فوج اس بھاری بھر کم بوجھ کے ہوتے ہوئے بھی جس سے آج کے سپاہی کا بلبلا اٹھنا ناگزیر ہے۔ چھ گھنٹوں میں باقاعدہ فوجی مارچ سے بیس میل سفر طے کرتی۔ اور دشمن کے نظر آنے پر اپنا سامان ایک طرف رکھ دیتی۔ اور مقابلہ کے لئے تن جاتی۔ جنگ کے وقت فوج کی ترتیب یہ ہوتی۔ سب سے آگے نیزہ باز۔ اسکے پیچھے عارضی فوج۔ اسکے پیچھے ریگولر پیدل فوج۔ اور بازؤں پر سوار۔ رومی فوجیں ایک جگہ جمع نہ رہتیں۔ بلکہ اقصائے ممالک میں بٹی رہتیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے:-

برٹن	تین لیجن[1]
لوئیر جرمنی	دو لیجن
اپر جرمنی	تین لیجن
روشیہ[2]	ایک لیجن
ناری کم[3]	ایک لیجن
پنوسیہ[4]	چار لیجن
ڈشیہ[5]	دو لیجن

---

[1] ایک لیجن ۱۲۵۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ [2] Rohotia
[3] Noricum [4] Panosia [5] Dacia

میشیہ[1]	تین لیجن
دریائے فرات کے کنارے پر	چھ لیجن
مصر	ایک لیجن
ہسپانیہ	ایک لیجن
افریقہ	ایک لیجن
دار الخلافہ روم	بیس ہزار چنے ہوئے سپاہی[2]

شاہ آگسٹس نے تمام دنیا کو لپیٹ لینے کی تجویز جو اُسکے جانشینان ما تقدم کا نصب العین رہا تھا۔ یک قلم روک دی اور سارے ملک میں رواداری اور اعتدال پسندی کی روح پھونک دی۔ اس شہنشاہ کا یہ خیال تھا کہ بیرونی فتوحات کا سلسلہ بند کر کے سلطنت کے اندرونی معاملات کی گتھیاں سلجھائی جائیں۔ اس لئے اُس نے اپنا وقت اچھی طرح گذارا۔ مگر اسکے جانشینوں نے عیش و عشرت میں ڈوب کر لوگوں پر ظلم و ستم کی راہیں کھول دیں۔ وہ خود فوجوں کا جائزہ لیتے۔ نہ ملک میں دورہ کرتے۔ بلکہ محلات میں بند رہ کر عیش و عشرت کی شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عیسائیت کا اثر بھی رومن فوج پر اچھا نہ ہوا۔ عیسائیت کا پہلا اصول حد سے بڑھی ہوئی بردباری اور رواداری ہے۔

---

[1] Maesia [2] ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر۔ از گبی جلد اوّل۔ باب اوّل

دوسروں سے بدلہ لینا آئین عیسائیت کا کچل ڈالنا ہے۔ اس اصول کی اشاعت نے رومن قوم کی رہی سہی فوجی روح بھی ملیا میٹ کردی۔ فوج کے سپاہی دور دور ملکوں سے برائیاں سمیٹ سمیٹ کر ساتھ لاتے اور انکی کھلم کھلا اور چوری چھپے دونو طرح سے اشاعت کرتے۔ اس کا رومن قوم پر بہت برا اثر پڑا۔ اسکے علاوہ جو فوج شہنشاہ کی ذاتی حفاظت کے لئے متعین تھی۔ اس نے شہنشاہ پر بے حد قابو پالیا تھا۔ اس کا زور توڑنے کو شہنشاہ نے کسی نہ کسی طرح اس کا ربط ضبط ہی بگاڑ دیا اور اسے کمزور کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس کا اثر بھی فوجی نظام پر بہت برا پڑا۔ شاہ کانٹنسٹائیں کے عہد حکومت میں فنون لطیفہ کو چار چاند لگے۔ اور لوگوں کے لئے طرح طرح کے سامان تعیش پھیل گئے۔ اسکے علاوہ اس نے رومی نسل کے لوگوں کو چھوڑ کر بربر قوموں کے آدمیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کردیا۔ ان تمام باتوں سے رومی قوم کی فوجی روح اور عسکری نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ اور اس قوم کا دور انحطاط پورے زور سے شروع ہوا۔ عین اس وقت اس کی ٹکر جفاکش اور جنگجو اسلامیوں سے ہوئی اور پھر یہ قوم سر کے بل ایسی گری کہ آج تک اس کا پتہ نہیں

فوجی نظام اور جذبہ عسکریت کے ساتھ کسی قوم کے عروج و زوال کی وابستگی کا راز یہ ہے کہ جب تک قوم غربت کے سبب سادہ زندگی بسر کرتی ہے اسوقت تک اس میں علیش کے سامان نہیں پھیلتے۔ اور اس کی فوجی روح قایم رہتی ہے

مگر جونہی اس میں دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ تو پھر اس میں عیش و عشرت کے سامان بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اس کی فوجی روح بھی مٹ جاتی ہے۔ جب تک رومی قوم سادہ زندگی بسر کرتی رہی۔ اُس وقت تک نظامِ عسکریت قائم رہا۔ اور جس وقت اس نے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اختیار کی۔ اور کثرتِ اموال کے سبب عیش و عشرت کے سامان اپنے ملک میں پھیلائے۔ تو اس وقت سے اس کا زوال شروع ہوا۔ اور آخر آغازِ اسلام کے وقت جب اس کی عربوں جیسی سادہ متوکل اور جنگ آزما قوم سے مٹھ بھیڑ ہوئی تو اس کا وقار ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔ فوجی ذہنیت کے بڑھاؤ گھٹاؤ کا یہ نظریہ رومی قوم تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ یہ تو تمام قوموں کی زندگی میں دہرایا جا رہا ہے۔ چنانچہ تواریخِ اقوام کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر رہتی ہے۔

سکندرِ اعظم کا نام بھی دنیا کے بڑے بڑے فاتحوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی ساری فتوحات اسی نظامِ عسکریت کے بل پر تھیں۔ اہلِ مقدونیہ اپنے آپ کو یونانی سمجھتے تھے۔ اور یہ ہے بھی ایک حد تک صحیح۔ کیونکہ ان کی زبان بھی یونانی زبان کی ایک شاخ ہے۔ سکندر کے باپ فیلقوس کا یہ دعویٰ کہ وہ بھی یونانی ہے۔ اہلِ یونان نے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ یونان فیلقوس کے زیرِ نگین آ چکا تھا۔ اس کا یونان پر دعویٰ اسی طرح پہنچتا

تھا جس طرح کہ اہل تھیبز۔ اہل سپارٹہ اور اہل ایتھنز کا اپنے اپنے وقت پر پونچتا رہا۔ فیلقوس بڑا دوربین شخص تھا۔ اُس نے یونان پر قبضہ کرنے کی اُس وقت ٹھانی جبکہ یونانی فوج خانہ جنگیوں کے ہاتھوں نڈھال ہو رہی تھی وہ لڑائی لڑے بغیر ہی یونان پر قبضہ کیا چاہتا تھا کہ ایتھنز کے مشہور خطیب ڈیماستھنز[۵۷] نے جو اِن دنوں یار لوگوں کا چلتا حربہ تھا۔ قوم کے آڑے آکر اس کے کام میں خواہ مخواہ کی السیٹ لگا دی۔ اِس لئے اُسے اہل ایتھنز سے کیرونیا[۵۸] کے میدان میں ایک لڑائی لڑنی پڑی۔ جس میں جیت اُسکی رہی اُس نے اپنی فوجی طاقت کو خوب بڑھایا اور اپنے آدمیوں کی فوجی ذہینت کو بہت بلند کیا۔ اُس کی فوج چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتی سردی میں بھی پچیس تیس میل روزانہ لپیٹ جاتی۔ اور کچھ دنوں کی رسد اور ضروری سامان بھی ساتھ رکھتی۔ اس کا فوجی ضبط ربط ایسا کڑا تھا۔ کہ اس وقت اس کی نظیر نہ ملتی تھی۔ فوج کو افسروں کی تابعداری کا سخت حکم تھا۔ جو فوجی بھرتی ہوتی۔ بڑی احتیاط سے ہوتی۔ اور زیادہ آدمی محنت کش کسان طبقہ سے لئے جاتے۔ اعلےٰ افسروں کا چناؤ اُن اعلیٰ اعلیٰ خاندانوں کے چیدہ چیدہ افراد سے ہوتا جو فوجی شہرت میں سب سے آگے ہوتے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ اہل سپارٹہ

---

[۵۸] Chaeromia [۵۷] Demosthenes

نے ایک نظام فوج کا قایم کیا۔ اس پر اہل اتھینز نے کچھ ایزادی کی۔ اور فیلقوس نے اسے تکمیل پر پہنچایا۔ یہ پیدل صف بستہ فوج بھاری بھاری آلات حرب سے لدی ہوئی اور سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبی ہوتی تھی۔ پلوٹارک اس فوج کو لوہے سے لدے ہوئے ہیبت ناک دیوؤں سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ فوج آلات سے خوب سجے ہوئے سپاہیوں کی سولہ قطاروں پر مشتمل ہوتی۔ اور صفیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں سات گز لمبا نیزہ ہوتا جسے انکی زبان میں سارِیسہ کہتے تھے۔ ان نیزوں کو پہلی پانچ قطاروں کے سپاہی دونوں ہاتھوں سے پکڑتے۔ اور منہ دشمنوں کی طرف کر لیتے۔ پہلی قطار کے نیزے خطِ مصاف سے پانچ گز آگے بڑھے ہوتے تھے یہی صورت باقی قطاروں کی ہوتی۔ اس میں یہ نکتہ تھا کہ اگلی قطاروں کے سپاہی پشت نہ دکھا سکتے تھے۔ کیونکہ مڑنے کی صورت میں انکے جسم پچھلی قطار والوں کے نیزوں سے چھلنی ہو جاتے تھے۔ اس فوج کے پیچھے اور دائیں بائیں رسالہ ہوتا توپ خانہ بھی ساتھ ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ انجینئروں کی ایک جماعت بھی رہتی جن کے پاس نئے نئے سامان قلعہ کشائی اور قلعہ بندی کے ہوتے۔ فیلقوس کی اس سپاہیانہ ذہنیت سے اہل مقدونیہ بڑے جنگجو سپاہی بن گئے۔ اور جنگ میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنا کس بل دکھانا ان کا طرۂ امتیاز ہو گیا ۔

فیلقوس کے بعد اسکے بیٹے سکندر نے مقدونیہ کا تخت سنبھالا۔ اُس نے
اِس فوجی نظام کی بدولت دنوں میں ہی وہ نام پیدا کرلیا۔ کہ تمام دنیا کی آنکھیں
اس کی طرف لگ گئیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ بچپن سے ہی
اُسکے کچھ ایسے لچھن تھے کہ ہر ایک کو خیال ہوتا تھا کہ اس کا نام ایک نہ ایک
وقت فاتحان دنیا کی فہرست میں ہوگا۔ اس کا باپ جب کوئی نیا ملک فتح
کرتا۔ تو وہ اپنے ہمجولیوں سے گلہ کرتا کہ میرا باپ میرے لئے کچھ نہ چھوڑے گا
اُس نے ابھی اکیسویں سال میں قدم نہ رکھا تھا۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا
تخت نشین ہوتے ہی اُس نے اپنے آپ کو چاروں طرف دشمنوں سے گھرا
پایا۔ کورنتھ کی حلیف حکومت تھریس کے باج گذار لوگ۔ اور کینہ ور دشمن جان
الی ریا[1] کے باشندے فیلقوس کی وفات پر تن گئے۔ اور اسکی تمام تنظیمی
کارروائیوں کو خاک میں ملانے اور اسکے باپ کے کئے کو بگاڑنے کے درپے
ہوگئے۔ کلیوپٹرا[2] فیلقوس کی دوسری بیوی تھی۔ جس کے بطن سے ایک بچہ
پیدا ہوا تھا۔ وہ ابھی شیر خوار تھا۔ اسلئے ایشیا میں اس بچے کے حمایتی
پیدا ہو گئے۔ اور انہوں نے سکندر کی مخالفت پر کمر باندھی۔ اس میں زیادہ حصہ
کلیوپٹرا کے باپ نے لیا۔ سکندر نے ان تمام مشکلات کا سامنا نہایت دانشمندی

---

[2] Cleopetra [1] Ilyria

سے کیا۔ اور اپنے دشمنوں کی تمام تجویزیں خاک میں ملا دیں۔ وہ ایسا بلند اقبال تھا کہ جس طرف سے گذرتا گیا۔ فتح و نصرت اُس کے استقبال کو آتی رہی۔ اور بغاوت خود بخود فرو ہوجاتی رہی۔ ایتھنز میں اُسکے باپ کے قتل پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اور اُسکے قاتل کی یادگار میں ایک اعزازی اعلان صادر کیا گیا۔ تھسلی بھی اکڑ بیٹھی تھی لیکن جونہی کہ سکندر پینیوس[۵] کے میدان میں پہنچا۔ اہل تھسلی نے بلا حیل و حجت اُسے اپنا سردار اعلیٰ چن لیا۔ اسی طرح ایتھنز نے بھی اُسے اپنا جرنل اعلےٰ بنالیا۔ اسی اثنا میں سکندر کی والدہ اولمپیس کے ایماء سے جس کی کلیوپیٹرا کے ہاتھوں فیلقوس کی حین حیات میں ہی بری درگت ہوئی تھی۔ کلیوپیٹرا اور اسکے بچے کا کام تمام کردیا گیا۔ اور اس طرح جو کانٹے سکندر کی راہ میں بچھائے گئے تھے، وہ سب ہٹا دیئے گئے اور سکندر کے لئے میدان صاف ہوگیا۔ اہل تھیبز نے بھی سکندر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ سکندر ڈبل مارچ کرکے تھیبز کی دیواروں کے سامنے جا ڈٹا۔ اور اس نے اہل تھیبز کو اطاعت کا موقعہ دیا۔ لیکن ان کے سروں میں ہولئے غرور بھر گئی تھی۔ اسلیئے انہوں نے سکندر کی فوج پر حملہ کردیا۔ اس پر سکندری افواج نے بھی جواب دیا۔ اور تھوڑی سی لڑائی ہی میں شہر سر ہوگیا۔ اور چھ ہزار آدمی تہ تیغ ہوئے۔ پھر

---

۵ Olympias ؎ Peneus

حلفاء کورنتھ کے متفقہ فیصلہ پر وہاں کی ساری آبادی لونڈی غلام بنا کے بیچ ڈالی گئی۔ اور ایک متبرک عمارت کے سوا باقی تمام شہر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اور ان کی تمام اراضیات حلفاء میں بانٹ دی گئی۔ اسکے بعد سکندر نے ایران کی سلطنت کے کچلنے کا تہیہ کیا۔ موسم سرما میں وہ فوجی تیاریاں کرتا رہا۔ اور گرما میں اس عظیم الشان مہم پر نکل پڑا۔ نکلنے سے پہلے اس نے اپنی شاہی جاگیریں جنگل اور خزانے اپنے دوستوں میں بانٹ دیئے۔ مقدونیہ کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک بڑا حصہ پیچھے چھوڑا۔ اور چونتیس ہزار سوار اور پیادہ فوج لے کر ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہوا۔ اس کی ایرانی افواج سے مختلف جگہوں پر مڈھ بھیڑ ہوئی۔ لیکن ہر جگہ ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ سکندر نے ۳۳۳ ق م میں جو لڑائی بمقام اسس[1] لڑی۔ اس میں ایرانیوں کی فوج سکندری فوج سے دس گنا زیادہ تھی۔ مگر وہاں بھی قضا نے فتح سکندر کے نام لکھی تھی۔ اس لئے اس لڑائی میں دارا کی جو ایک بگڑی ہوئی قوم کا بگڑا ہوا بادشاہ تھا۔ بڑی کرکری ہوئی اور اس نے بدحواس ہو کر اپنا عیال و اطفال کارزار میں ہی چھوڑا اور خود دم دبا کر بھاگ گیا۔ اور جب وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو اپنی رتھ اپنی ڈھال اور اپنا شاہی لباس وہاں ہی پھینک ایک بادرفتار اسپ پر سوار ہو کر نکل گیا۔ سارے ایشیائے کوچک کے زیر کر لینے کے لئے شام اور مصر کا فتح کرنا ضروری تھا

---

[1] Issus

اس لیے سکندر نے شام کے مشہور شہر ٹائر کی طرف جو سارے ملک کی کنجی تھی اپنی عنان توجہ منعطف کی۔ اہل ٹائر قلعہ بند ہوکر بیٹھ گئے۔ اور اس کے سر کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوا۔ مگر واہ رے اقبال سکندری۔ کہ مشکل سے مشکل کام بھی آسان سے آسان ہوتا گیا۔ جب یہ شہر سر ہوا تو آٹھ ہزار آدمی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ اور کوئی تیس ہزار غلام بناکر بیچ ڈالے گئے۔ اس لڑائی کے مفصل حالات تاریخ میں ملاحظہ فرمائیے۔ سکندر کو بابل فتح کرنے کے لیئے ایک اور لڑائی لڑنا پڑی۔ یہ لڑائی گاگامیلہ[۱] کے نزدیک ایک میدان میں لڑی گئی۔ اس لڑائی میں ایرانی فوج کوئی ڈیڑھ لاکھ تھی۔ اس میں بھی دارا کو شکست ہوئی۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سکندر نے اسکا پیچھا کیا۔ اور وہ بابل تک جا پہنچا۔ اہل بابل نے سکندر کا استقبال کیا۔ اور بابل کے ساتھ سوسی آنہ[۲] اور پرسیس[۳] بھی اس کے مطیع ہوئے۔ دارا اب اکبٹانہ[۴] میں تھا۔ سکندر نے چند سواروں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ اور دن رات ایک کرکے اُسے ایک ایسے مقام پر جالیا۔ جہاں وہ جان کنی کی حالت میں تھا۔ اس کی کیفیت اس طرح پر ہے۔ کہ جب دارا کے ساتھیوں نے دیکھا کہ سکندر کے سپاہی اب اُنہیں لیا چاہتے ہیں۔

Susiana ۲ Gaugamela ۱
Ecbatana ۴ Persis ۳

تو وہ گھبرا اُٹھے۔ اور انہوں نے دارا کو جواب تک پالکی میں سفر کر تا رہا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کو کہا۔ وہ تو دوڑا دوڑ اور بھاگم بھاگ کے عالم میں تھے۔ اور ادھر دارا میں بھاگنے کے اوسان بھی نہ رہے تھے۔ اِسلئے اسکے ساتھی اُسے خنجر مار کر وہیں چھوڑ گئے۔ ایشیا رکوچک اور ایران کو فتح کر کے سکندر نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ہندوستان کے بارہ میں عجیب عجیب خوش کن حالات اس کے کانوں میں پہنچ لئے تھے۔ یعنی کہ وہاں زر و جواہر کی ریل پیل ہے۔ اور وہاں عجیب عجیب قسم کے جانور درندے۔ درخت اور پودے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر بات کچھ اور تھی۔ وہ یہ کہ۔ رند سے

پابندِ اِک مقام کے ہوتے نہیں ہیں مرد
شیروں کے واسطے ہیں نیستاں نئے نئے

اِن دنوں شمالی ہند میں تین سلطنتیں تھیں۔ دریا سندھ۔ اور جہلم کے درمیان کا علاقہ راجہ امفس[ف] کے زیر حکومت تھا۔ اس کا دار السلطنت ٹیکسلا تھا۔ اسکا بھائی ہزارہ اور کشمیر پر حکمران تھا۔ دریا جہلم کے اس طرف راجہ پورس کی زبردست سلطنت تھی۔ راجہ ٹیکسلا نے لڑائی لڑے بغیر ہی اطاعت قبول کر لی۔ اور اس طرح اپنی جان بچالی۔ اب سکندر کے آگے راجہ پورس کا ملک تھا۔ اِسلئے وہ دنوں کی منزلیں گھنٹوں میں لپیٹ کر راجہ کی سرحد پر جا پہنچا۔ راجہ بھی ایک

ف Omphis

کار آزمودہ سپاہی تھا۔ اُس نے تلواروں۔ نیزوں سے پیادوں۔ سواروں اور ہاتھیوں سے اس کا استقبال کیا۔ اور اُس سے خوب دو دو ہاتھ کیے۔ مگر شیر کے آگے چیتے کی کیا دال گل سکتی تھی۔ اس کی فوج سکندری فوج کے ہاتھوں بُری طرح پٹی۔ اور میدان سکندر کے ہاتھ رہا۔ سکندر راج ریت کا جاننے والا اور بادشاہوں کے آئین کا پالنے والا تھا۔ اس نے راجہ سے شاہانہ سلوک کر کے اپنی شہنشاہت کا مان رکھ لیا اور اُسے اس کا ملک جوں کا توں پھیر دیا۔ جو فوجی چال اس لڑائی میں سکندر نے چلی۔ وہ اس کی فوجی حکمت عملی اور دانشمندی پر گواہ ہے۔ راجہ کی فوج دریا جہلم کے اِس وار ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ اس وقت جبکہ رات سیاہ چادر تانے سوئی تھی۔ اور دونو طرف کے بہادر نیند کی گود میں اونگھ رہے تھے سکندر نے اپنی کچھ فوج وہاں ہی سامنے کے کنارے پر چھوڑی اور باقی فوج ساتھ لے کر سولہ میل اوپر جا کر اندھیرے منہ دریا عبور کیا۔ راجہ کی فوج میں پرچہ لگا کہ سکندر تو راتوں رات فوج اوپر لے اڑا۔ اور اب دریا کے پار ہوا چاہتا ہے اس پر راجہ کی فوج بھی اس طرف دوڑی دوڑی آئی۔ اور ایک مقام پر دونو فوجیں آگا پیچھا دایاں بایاں سنبھال کر آمنے سامنے ہوئیں۔ راجہ کی فوج کے آگے قوی ہیکل ہاتھی تھے۔ یونانیوں نے یہ نقشہ کبھی دیکھا نہ تھا۔ سخت گھبرائے۔ مگر سکندر ایرانیوں اور دوسری جنگجو قوموں کے ورق الٹتا چلا آیا تھا۔ وہ ہندیوں کی اس نقلی قلعہ بندی کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ اِس کی سپاہیانہ دانشمندی یہاں

بھی آڑے آئی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہاتھیوں میں کس طرح برہمی پیدا کی جا سکتی ہے۔ وہ بول اٹھا کہ بہادرو۔ دیکھتے کیا ہو۔ دھاوا بول دو۔ فوج کا ٹوٹ پڑنا تھا۔ کہ ہاتھی تیروں کی بوچھاڑ۔ نیزوں اور تلواروں کی بھرمار سے زخمی ہوئے اور بدحواس ہو کر پیچھے کو بھاگے۔ اور جو سامنے آیا لانگھتے پھلانگتے روندتے لتاڑتے چلے گئے۔ اس طرح راجہ کے ہزاروں سپاہی پامال ہوئے۔ بجلی کو چمکنا رعد کو گرجنا۔ بادل کو برسنا۔ اور سورما سپاہیوں کو تلواریں سونتنا۔ اور برچھی کی انیاں منہ پر لینا کون سکھائے۔ سکندری فوج ہندیوں پر ایسی گری جیسے نیولا سانپ پر اور باز شکار پر گرتا ہے۔ اور انہوں نے دم کے دم میں اژدر کے کلے چیر کر رکھ دیئے۔ ہندیوں میں وہ بھاگڑ پڑی کہ پناہ بخدا۔ کسی کا سر ہے تو پاؤں نہیں۔ ٹانگ ہے تو ہاتھ نہیں۔ دھڑ ہے تو سر نہیں۔ غرضیکہ ہزاروں کا کھیت ہوا۔ اور بہادر راجہ دل ہی دل میں کٹ کٹ کر رہ گیا۔ پھر بھی راجہ ساکھا کیے رہا۔ اور کچھ عرصہ ڈٹ کر لڑتا۔ اور ہمت مردانہ کے جوہر دکھاتا رہا۔ آخر جب وہ بھی گھایل ہو کر بے بس ہوا۔ تو گرفتار ہوا۔ اب سکندر کی فوج تھکی ٹوٹی اور چکنا چور ہو رہی تھی۔ ملتان تک جا کر آگے نہ بڑھ سکی۔ اس لئے وہ وہیں سے الٹے پاؤں پھرا اور بڑی مصیبتیں جھیل کر نکران کے ریگستان سے ہوتا ہوا بابل پہنچا۔ اب جزیرۃ العرب کو زیر کرنے اور بابل کو دارالسلطنت بنانے کی آرزو اس کے دل میں لہریں لینے لگی۔ اور اس نے بحری مہم تیار کی۔ فوج کی موجودات

لینے اور اُسے روانہ کرنے سے پہلے سکندر نے ایک شاہی دعوت دی۔ دعوت ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی۔ کہ اُسے بخار چڑھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اور جوں جوں دوا کی مرض بڑھتا گیا۔ وہ جس زمین کی گود میں کھیلا۔ اور پلا تھا۔ اب اُس سے ہزاروں کوس دور پڑا دم توڑ رہا تھا۔ جوانی اپنا منہ چھپائے اس کا منہ تک رہی تھی بڑھاپا سرھانے کھڑی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر لحظہ بہ لحظہ اُس کا رنگ اڑا جاتا تھا۔ اقبال کی آس ٹوٹتے جارہی تھی۔ اور دولت کا منہ سوکھ رہا تھا۔ غرضیکہ وہاں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو حال سے بے حال نہ تھا۔ آخر اُس نے عمر کے بتیس ۳۲ سال اور کچھ مہینے پورے کئے اور سب کو داغ حسرت دیا۔ ابھی سکندر کو دنیا میں آئے کے سال ہوتے تھے۔ کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ اور ساری قوم کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ سارے ملک نے اس لہلہاتے پھول کا سوگ رکھا۔ ایسا پھول چمنستان مقدونیہ میں پھر نہ کھلا۔ اور نہ اس کے رنگ و بو کا پھر وہاں پتہ لگا۔ امیر ؎

پھول اے بلبل نہ پھولوں پر دو روزہ ہے بہار
ایک جھونکے میں ہوا سب رنگ و بو ہو جائیگا

اللہ اللہ! اس دہر پرفن نے کیا کیا ورق الٹے۔ اس مادر پیر زال نے کس کس کو گودی میں کھلایا اور سلایا۔ اس فلک واژگوں نے کس کس کو اوندھا گرایا اور لتاڑا۔ بچارے سکندر مقدونوی پر ہی کیا منحصر ہے۔ ایسے ہزاروں سکندر خاک سے اٹھے اور خاک میں سوئے۔ ایسے ہزاروں کھیل بنے اور بگڑے۔ ؎

کھیل ہے پتلیوں کا بزم جہاں کا عالم
رات بھر کا یہ تماشہ ہے سحر کچھ بھی نہیں

تاریخ قدیم میں پارتھیہ[۱] کا نام مشہور چلا آتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ بحر جرجان کے جنوب مشرق کو سلسلہ البرز سے ہرات تک چلا گیا ہے۔ اس کے جنوب کو وسطی ایران کا صحرائے عظیم اور شمال کو ہرکانیہ[۲] کا زرخیز علاقہ اور تورانی صحرا ہے گویا عہد عتیق کا پارتھیہ آج کا خراسان ہے۔ یہاں ایک ایرانی قوم کی نسل آباد تھی۔ اس کے دارالسلطنت پارتھیہ کے آثار اب تک زمانہ حال کے قصبہ دمگن[۳] کے اردگرد پائے جاتے ہیں۔ سکیتھی[۴] زبان میں پارتھی جلاوطن شدہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ ان سکیتھی کی اولاد سے جن کو دیس نکالا ملا تھا۔ اس لئے پارتھی کہلائے[۵]۔ یہ لوگ اہل اسیریا اور میڈیا[۶] کے ازمنہ عروج میں زندگی بسر کرتے رہے جب مشرق کی سلطنت اہل میڈیا کے قبضہ اقتدار سے نکل کر اہل پارس کے ہاتھ آئی۔ جب بھی پارتھیوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اسکے بعد یہ لوگ جب اہل مقدونیہ کے زیر حکومت آئے تو انہوں نے سر نکالا اور ایسا نکالا کہ آس پاس

---

۱ Parthia
۲ Hyrcania
۳ Damghan
۴ Scythian
۵ دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹینکا آرٹیکل بر پارتھیہ۔
۶ Media

کی تمام قوموں کو نیچا دکھایا۔ اور اپنے جنگجویانہ کارناموں سے تمام دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ رومی اُس وقت بھی جبکہ ان کی جمہوریت کا ستارہ اقبال ابھی گہنا نہ تھا۔ ان سے کئی بار اُلجھے اور اُنھوں نے انبوہ در انبوہ فوج کے ساتھ پے در پے تین بار اُن پر حملے کیے۔ مگر اُنھیں ہر بار ناکامی ہوئی۔ اُن دنوں رومی فوج کا رُعب اقصائے عالم پر چھایا ہوا تھا۔ اور تمام قومیں اُن سے دبتی تھیں۔ پھر بھی اُن کے آگے رومی فوج کی کچھ پیش نہ گئی۔ بلکہ جتنی دفعہ سامنے آئی۔ اُس نے منہ کی کھائی۔ اور اپنی عزت و آبرو گنوائی۔ اس قوم کی شجاعت اور بسالت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ قوم اسیری میڈی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان پھلتی پھولتی رہی اور کانٹوں پر ہوتے ہوئے بھی اُس کی بیل ایسی منڈھے چڑھی کہ تمام دنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اُن کی سلطنت ۲۵۰ء قبل مسیح سے ۲۲۸ء ولادت مسیح تک پورے اوج موج پر رہی۔ اور اٹھارہ ملک اپنے کنار میں لیے رہی۔ مقدونیہ اور بابل بھی جو عہد عتیق کے گہوارہ ہائے تہذیب تھے۔ ان کے زیر نگین تھے۔ ان کی قومی آبرو تلوار کی آبداری سے تھی۔ ان کی اُٹھان نیزہ کی نکیلی آن سے تھی۔ اُن کی جنگجویانہ مسابقت اور قومی دوڑ دھوپ انکے صبا رفتار گھوڑوں کی بادپیمائی سے تھی۔ گویا کہ اُن کی ساری شان و شوکت عسکری ذہنیت کے بل بوتے پر تھی۔ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے شکار کیے ہوئے جانوروں کا گوشت

کھاتے اور اس کے سوا اور کسی قسم کے گوشت کے نزدیک بھی نہ جاتے تھے۔ گویا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے شکاری تھے۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کس قدر سلجھے ہوئے سپاہی تھے۔ اِس کے علاوہ وہ سواری کے سخت عادی تھے۔ وہ ہر کام گھوڑے پر سوار ہو کر کرتے تھے۔ دعوتوں کو جاتے تو گھوڑے پر سوار ہو کر عام اور رنج کی تقریبوں پر جاتے۔ تو سوار ہو کر۔ سفر کرتے تو گھوڑے پر۔ پھرتے تو گھوڑے پر۔ بات چیت کرتے تو گھوڑے پر۔ گویا انکا ہر کام سواری کی حالت میں سرانجام پاتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ کھڑے تو ہوئے تھے اپنے پاؤں پر مگر اپ پاؤں سے چلنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں سخت مزاجی۔ اکھڑ پن۔ تندخوئی اور بے رحمی مردوں کے لئے لازمہ حیات سمجھے جاتے تھے۔ اِس سے بڑھ کر اُن میں ایک بات یہ تھی کہ وہ دوسروں سے خواہ مخواہ اُلجھے رہتے۔ اور لڑائی کا شاخسانہ کھڑا کئے رکھتے اور ایسا کرنے پر وہ عادتاً مجبور تھے۔ اُن کا قومی آلۂ جنگ تیر و کمان تھا۔ جس کے استعمال میں وہ بڑے طاق تھے۔ وہ ہمیشہ گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑائی کرتے۔ گویا کہ اُن کی ساری کی ساری فوج ایک منظم رسالہ تھی۔ اُن کے لڑنے کا اندازہ بھی اس وقت کی تمام قوموں سے نرالا تھا۔ کبھی پیچھے ہٹتے۔ کبھی آگے بڑھتے اور ہر حالت میں دشمنوں پر تیر چلاتے رہتے۔ کبھی وہ یوں ہی پیچھے کو دوڑ پڑتے اور دشمن سمجھتا کہ وہ شکست کھا کر بھاگ نکلے ہیں۔ اور

جب دشمن ان کا پیچھا مارنے کی کرتا تو وہ موقعہ تاڑ کر اُلٹ پڑتے۔ اور اُس کی خوب خبر لیتے۔ وہ بھاگتے ہوئے بھی تیروں سے دشمنوں کے کلیجے چھلنی کر دیتے رومیوں سے جو لڑائیاں انہوں نے لڑیں اُن میں ان کی کامیابی کا راز انکی بڑھی ہوئی جنگی ذہینت تھی۔ ۵۳ ق م میں انکی رومیوں سے ایک مقام پر مٹ بھیڑ ہوئی۔ رومی تو بڑے بانے باندھ کر آئے تھے۔ مگر ان کی ساری تجویزیں خاک میں مل گئیں اور دنیا بھر میں روسیاہی ہوئی۔ جنگی مجاوثت میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ وہ اِس اِس طرح کے پیچ مارتے کہ دشمن کو خبر تک نہ ہوتی۔ رومی تھے ذرا سیدھے سادھے۔ اور یہ تھے بڑے چالاک۔ جب رومی فوج ان کے سامنے ہوئی۔ تو یہ رومیوں کی نظر میں نہ جچے۔ ان مکاروں نے اپنی فوج کا ایک حصہ نزدیک ہی کسی جگہ ٹیلے کی اوٹ میں چھپا رکھا۔ اور چمکیلے فوجی اسلحہ کو کپڑوں سے ڈھک رکھا تھا۔ رومی اُن کی گھاتیں کیا جانیں۔ انکی چالیں کیا سمجھیں۔ یہ دونو فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو انہوں نے اوزاروں اور ہتھیاروں کی جھنکار سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان کے ڈھولوں کے ساتھ گھنٹے گھنٹیاں لٹکتے ہوتے تھے۔ جن کی آواز سے ہزاروں درندے چیختے چلاتے سنائی دیتے تھے۔ اس شور و شغب سے رومیوں کے دل دہل گئے۔ اسلحہ کی چمک دمک سے انکی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور تیروں کی بوچھاڑ سے اُن کے جسم چھلنی ہو گئے۔ رومی سخت تنگ آئے۔ جب وہ یونہی کھڑے

سہتے تو پارتھی ان کو دم نہ لینے دیتے۔ اور جو یہ دست بدستی لڑائی کے لئے تلواریں سونت کر دوڑ پڑتے۔ تو پارتھی دوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے اور پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی تیروں کی بوچھاڑ کرتے رہتے۔ علیٰ ہٰذا اس وقت پارتھی فوج جو تاک لگائے بیٹھی تھی۔ یکایک نکل کر ٹوٹ پڑی۔ اور اس نے گھوڑوں کے ٹاپوں سے ایک ایسا طوفان برپا کر دیا۔ کہ رومیوں کو کچھ دکھائی دیتا۔ نہ کچھ سنائی دیتا پھر تیروں کی وہ بوچھاڑ کی۔ کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور وہ ایسی ستی بھولے کہ الاماں۔ آخر گھمسان کا رن پڑا جس میں رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور اُن میں ایسی بھاگڑ پڑی۔ کہ کسی کو سر پیر کی خبر نہ رہی۔ اس دفعہ رومی فوج کا وہ ستھراؤ ہوا کہ الحفیظ۔ ہزاروں آدمی کھیت رہے۔ رومی شکست کا صیغہ ہی پڑھے ہوئے نہ تھے۔ اور یہاں کرنا پڑی الٹی لمبی چوڑی گردان۔ غرضیکہ ان کی بڑی کرکری ہوئی۔ کرکری کیا ہوئی ناک کٹ گئی۔ عزت برباد ہوئی آبرو پر پانی پھر گیا۔ فوجی رعب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ تھے اپنے یہاں بڑے سلجھے ہوئے سپاہی۔ اور اُن کی سپاہگری کی دھاک تھی بیٹھی ہوئی چار دانگ عالم میں۔ ادھر ان کا مقابلہ پڑا پارتھیہ کے سرتے اور سپایانے سواروں سے نتیجہ یہ کہ ان کا غرور ٹوٹا اور اُن کے وقار کا بھانڈا پھوٹا ؎

پھر نہ تو وہ سناں تھی نہ وہ روک ٹوک تھی

سب مٹ گئی سپاہگری کی جو نوک تھی

پارتھیوں کا یہ سارا طمطراق اور کس بل صرف جنگی ولولہ پہ تھا۔ اسکی بدولت ان کی سلطنت کوئی چار سو سال تک قائم رہی۔ مگر جب اس قوم میں بھی ضعف کے جراثیم پیدا ہوئے اور ان کی فوجی ذہنیت کو گھن لگا۔ تو پھر یہی قوم دوسروں کے لیے من بھاتا کھاجا بن گئی۔ اور ایسی اوندھی گری کہ اب کوئی بھول کر بھی اس کا نام نہیں لیتا۔ یہ قوم ضرور ایک وقت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی۔ مگر ساتھ ہی یہ اچھلی کودی اور مستی کی جھونجل میں ایسی نیچے گری کہ پاتال کا پتہ لائی ہے

دو دن کی زندگی پہ نہ اتنا اچھل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

اس کی یہ اچھل کود اس وقت تو معلوم ہوتی تھی۔ دولت لازوال اور ہمیشہ کا اقبال۔ مگر اب جب یہ گری۔ تو وہی اقبال بعد والوں کو دودھ کا ابال اور قہر ذوالجلال نظر آیا۔ یہ بات اسی قوم پر کیا موقوف ہے عجب پرادبار کا یہ نازک وقت اور ٹیڑھا موقعہ آیا ہے۔ آپ ہی غور کریں کہ وہ کونسی قوم ہے جس کے دل میں ترقی کے خیال نے لہریں نہ لی ہوں۔ اور جس کا دل ابھرنے کے لیے سینوں بیتاب نہ رہا ہو۔ اس لئے کہنا ہی پڑتا ہے کہ یہ وقت سب

لہ ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۸۔ ص ۷۴ تا ۷۵۔

قوموں پر آیا۔ اور خیال نے حقیقت کی۔ آرزو نے وصال کی اور اُمنگ نے اصلیت کی صورت اختیار کی۔ اِس طرح بھی کچھ زمانہ گذرا۔ پھر قوم الٹے پاؤں پیچھے ہٹی۔ اور ہٹتے ہٹتے ایسی ہٹی کہ بس رہ ہی گئی۔ اب نہ وہ اُمنگ تھی۔ نہ وہ آرزو نہ وہ خیال۔ اب ساری قوم پر کچھ اوس سی پڑی ہوئی۔ اور بیکسی سی چھائی ہوئی تھی۔ کیا اسی ایک قوم کے اِس وقت اور اُس وقت میں اندھیرے اُجالے کا فرق نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔ زمانہ کی رفتار ہی ایسی ہے فطرت کا آئین ہی اسی طور ہے۔ کوئی بھی اِس آئین سے ایک قدم آگے پیچھے نہیں ہو سکتا ؎

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

چنگیز خاں کا نام تاریخی دنیا میں بہت مشہور چلا آتا ہے۔ وہ ان گنتی کے شہسواروں میں سے ایک تھا جن کی دھاک چار دانگ عالم میں بندھی۔ اور جن کا لوہا سب نے مانا۔ اُس کی قوم میں فوجی روح کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اِس پر چنگیز خاں ایسے جنگجو کی سرکردگی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اُس کی جنگجویانہ طبیعت کے ابھارنے کے لئے کچھ قدرتی اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ ایک تو وہ خود جنگجو باپ کا بیٹا تھا۔ اِس لحاظ سے نبرد آزمائی اُس کی فطرت میں داخل تھی۔ دوسرے یہ کہ جس قوم سے وہ تھا۔ اُس کا

شغل ہی تلوار زنی اور دشنہ ورزی تھا۔ تیسرے جب اس کا باپ مرا تو سلطنت کا سارا بوجھ اُس کے سر پر آ پڑا۔ ترکی و منگولی کے رواج کے رو سے باپ کی وراثت سب سے چھوٹا بیٹا پاتا ہے۔ چنگیز خاں اپنے باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس لئے وہ تاج و تخت کا وارث ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اُس کا باپ تیس ہزار خانہ بدوش قبائل کا سردار اعلیٰ تھا۔ ان قبیلوں پر حکمرانی کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ چنگیز خاں کو حکومت کے قابل نہ سمجھ کر تین ثلث قبائل اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اس کی والدہ نے جب دیکھا کہ اب سر رشتہ حکومت ہاتھ سے جاتا ہے۔ تو وہ جھٹ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اور جھنڈا ہاتھ میں لئے بھگوڑوں کے پیچھے پڑی۔ بھگوڑے اُسے دیکھ کر بڑے نادم ہوئے۔ اور اس کے پیچھے ہو لئے۔ ایسی بہادر والدہ کی دیکھ بھال نے بیٹے کا حوصلہ بڑھایا۔ اور اُسے سپاہیانہ جنگ آزمائی کا گر بتایا۔ چوتھی بات یہ تھی کہ اُس کے باپ نے عیسائی کیرات ترکوں کے سردار اعلیٰ کو اپنا دستار بدل بھائی بنا کر اُس سے رشتہ محبت جوڑ لیا تھا۔ یہ سردار اپنی جنگجویانہ فطرت کی وجہ سے طغرل (ہلاک کرنے والا) کے لقب سے مشہور تھا۔ چنگیز خاں کا باپ شمالی قوم کا اس طرح ساجھی بن گیا تھا۔ مشرق کی طرف کنگرادون کا مشہور

Kungrads ۵ے

خاندان ملک سنبھالے ہوئے تھا۔ اور اس کا بجائے خود ترکوں اور تاتاروں اور
پانچو[1] قوم کے لوگوں سے رابطہ اتحاد تھا۔ چنگیز خاں کے باپ نے اس خاندان
کے سردار اعلیٰ کی لڑکی سے اپنے بیٹے کی نسبت ٹھیرائی۔ اور پھر شادی بھی کرلی
اُس سے اُس کا رشتہ محبت ان تمام قبایل سے ایسا جڑا کہ پھر نہ ٹوٹا۔ اس
کڑی فضا میں ان جنگ آزما قبائل کے درمیان اور ان گردوپیش کے حالات
میں چنگیز خاں کی تربیت ہوئی۔ اور ان قوموں کے ساتھ اس کا رابطہ اتحاد
بڑھا۔ یہ بھی ایک بات تھی جس سے چنگیز خاں کی جنگجو طبیعت اور بھی چمک
اُٹھی۔ یہ بیٹا اور وہ ماں۔ دونوں نے مل کر حکومت کا سکہ خوب بٹھایا۔ انکے ملک
کے قرب و جوار میں جو لوگ آباد تھے۔ وہ غارت گری اور لڑائی بھڑائی میں بڑے
طاق تھے۔ یہ لوگ نیمان[2]۔ کیرات اور مرکیت[3] کی جری قوموں سے تھے چنگیز خاں
ایک نہ ایک کے ساتھ سنہ ۱۲۰۶ء تک لڑتا بھڑتا رہا۔ یہ بھی ایک جبری جنگی تربیت
تھی۔ جو چنگیز خاں اور اس کی قوم کو ملتی رہی۔ اس نے سنہ ۱۲۰۶ء میں اپنی سلطنت
کے اُمرا دریا اونن[4] کے کنارے بلائے اور اُن کی متفقہ رائے سے چنگیز خاں
کا لقب اختیار کیا[5] جسے ان کی زبان میں "بہادر سپاہی" کہتے ہیں۔ وہ

۱؎ Manchu ۲؎ Naiman ۳؎ Markits

۴؎ Onen ۵؎ چنگیز خاں کا نام تیموچن۔

ُاُس سپاہگری میں ایسا شاق ہوگیا تھا۔ کہ بڑے بڑے گل چلے استاد اُس کے آگے کان پکڑتے۔ اور اُس کی جوتیاں سیدھی کرنی فخر سمجھتے تھے۔ اِس وقت تک اس کا ایک دشمن مار آستین باقی رہا تھا۔ اور وہ نیمان خاں تھا۔ جو مفسدہ پردازی کے بانے باندھے تاک میں بیٹھا تھا۔ چنگیز خاں نے اسکے خلاف صف آرائی کر کے اُسے بھی نیچا دکھایا۔ اور اُسے مار بھگایا۔ اِس سے اُس کا فوجی حوصلہ اور بھی بڑھا۔ اِن سب باتوں سے سوا ایک امتیازی بات منگول قوم کے اِس سردار اعلےٰ میں یہ پیدا ہوگئی تھی۔ کہ اُس نے اپنا قومی قانون اپنی تمام سرگرمیوں کا معیار بنالیا تھا۔ اور وہ اِس مستشار اعظم سے ایک انچ بھی آگے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ یہ قانون پرانے ترکی اور وحشیانہ رسم و رواج کا ایک مجموعہ تھا۔ اِس قانون کی سخت گیری کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے جس قدر مظالم جابجا ڈھائے وہ اِسی قانون کی لفظ بہ لفظ تعبیر تھی۔ اِس قانون کے اجراء کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری منگول قوم ایک تار میں پروئی گئی۔ اور ایک واحد قانون کے دائرے میں آگئی۔ اِس قوم کے چھبیس ۲۶ منگولی قبیلے اور اُنیس ترکی اور دیگر قبیلے پہلے ایک دوسرے سے تنے رہتے تھے۔ قانون کے متحدہ اشتراک عمل نے ان کو ایک متحدہ قوم کی صورت میں بدل دیا۔ وہ اب نہ تو نیکرین[۵] تھے۔

---

[۵] Nekrins

نہ اُرمن گُٹ[ف۱] نہ رو براد۔ نہ تجیوٹ۔ نہ تاتار۔ نہ مرگود۔ نہ نیمان نہ کیرات[ف۲]۔ نہ برلاس نہ برلاس۔ نہ بارین۔ نہ ارلاد۔ اور نہ جیلار۔ وہ اب کیا تھے؟ وہ اب منگول تھے۔ اور منگول بھی "نیلے[ف۳] منگول"۔ اسے دنیا کی پہلی قوم کہنا چاہیئے۔ جو ایک نظام کے تحت آ کر صفحہ روزگار پر نمودار ہوئی۔ یہ تھی وہ فوجی روح اور عسکری ذہنیت جو چنگیز خاں ایسے سپہ سالار نے ان جنگجو قبیلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ ان ساری باتوں نے مِل ملا کر چینگیزی قوم میں وہ فوجی ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ کہ اس نے وسط اشیا کی جری سے جری قوم کو لتاڑ کے چھوڑا۔ مورخین چنگیز خاں کی جدت طبع کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "وہ آدمیوں کا حقیقی لیڈر تھا۔ (اگر کوئی لیڈر ہو سکتا ہے) کہ اُس نے اپنی قوم کے متفرق قبیلوں میں کچھ ایسی روح پھونک دی۔ کہ جذبہ قومیت خود بخود پیدا ہو گیا۔ گویا چنگیز خاں خود نیا تھا۔ اس کی قوم نئی۔ اس کا قانون نیا۔ اس کی فوج نئی۔ اس کی تنظیم نئی۔ اُسکی رفتار نئی۔ اس کی گفتار نئی۔ ناسخ سے

ف۱ Tajuits – Birads – Urmanguts –
Naimans – Merqueds – Tertars

ف۲ Arlads – Barins – Barlass – Keraits – Jelairs

ف۳ Blue Mongols

بول چال ایسی کسی کی بھی نہیں دنیا میں
تری گفتار نئی ہے تری رفتار نئی

اب ذرا چنگیز خاں اور اسکی قوم کے جنگی کارناموں کا تھوڑا سا حال بھی سُن لیجیے۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے شمالی چین کو جو سنگ[اے] خاندان سے لی گئی تھی۔ واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ اُس نے اُٹھتے ہی پہلے ہا[یہ] پر حملہ کیا۔ اور بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ سدسکندری کے ولنگ[ہے] ہے کے درسے پر قابض ہو گیا۔ اور ننگ[ھے] سیافی تک جا پونچا۔ پھر اُس نے ساری چینی سلطنت کو پامال کرنے کی نیت سے ۱۲۱۳ء کی خزاں میں تین فوجی مہمیں تیار کیں۔ ایک مہم اپنے لڑکوں کی قیادت میں جنوب کی طرف اور دوسری اپنے بھائیوں کے زیر سرکردگی مشرق کی طرف روانہ کی۔ اور ایک مہم کا وہ خود سر عسکر بن کر جنوب شرقی سمت کو چل پڑا۔ تینوں مہمیں کامیاب ہوئیں۔ صرف پہلی ہی مہم نے اٹھائیس۲۸ شہر فتح کیے۔ اِس طرح باقی مہموں نے بھی بہت سا علاقہ چین کا فتح کیا۔ واپسی پر اُس نے ۱۲۱۴ء میں کن شہنشاہ کو یہ پیغام بھیجا۔ کہ شانٹنگ میں تمہارے تمام مقبوضات اور زرد دریا کے شمال کی طرف کے

اے Hia   ا Sung

ہے Ningsia Fu   ھے Wuleang-hai

سارے علاقے باستثنائے پیکنگ کے اب میرے ہیں۔ آسمانی حکم سے اب تم اِس قدر کمزور ہو جس قدر کہ ہیں طاقتور ہوں۔ ہیں اس شرط پر اپنی فتوحات بند کرتا ہوں۔ کہ تم میرے افسروں کو بیش بہا عطیات اور تحائف دو۔ یہ شرطیں کن بادشاہ نے غنیمت سمجھ کر بلا تامل مان لیں۔ اور اُس نے بطور پیشکش صلح کے چنگیز خاں کو شہنشاہ سابق کی ایک دختر دوشیزہ پانسو غلام و کنیزکیں اور تین ہزار گھوڑے بھیجے۔ لیکن جب چنگیز خاں نے سدِ اعظم سے باہر قدم رکھا۔ اور اپنے دارالسلطنت کا رخ کیا۔ تو کن شہنشاہ نے منگول سرحد کی نزدیکی کو خطرناک سمجھ کر اپنا دارالخلافہ ہونن[۵۵] کے علاقہ ہیں تبدیل کر دیا۔ اس سے چنگیز خاں کو شہنشاہ کے مخالفانہ رویہ کا شبہ ہوا۔ اور اُس نے دوبارہ دھاوا کر کے ملک کو خوب روندا۔ عین اس وقت نیمان سردار کو جو پہلے چنگیز خانی فوج کے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ انتقام کا شوق چرایا۔ اور اُس نے خواہ مخواہ اُنزچ کی لی۔ لیکن کیا پدڑی اور کیا پدڑی کا شوربہ۔ اُس کی چنگیزیوں کے آگے کیا دال گل سکتی تھی۔ آخر شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ اِس وقت تک خوارزم کی سرحد تک کا سارا علاقہ چنگیز خاں کے قبضے ہیں آ چکا تھا۔ خوارزم بھی اُس کی لتاڑ پچھاڑ سے نہ بچا۔ حیرانی کی بات ہے کہ سارا خوارزم چنگیزی فوج کی ٹکر نہ اٹھا سکا۔ اور ایسا پامال ہوا۔ کہ اس کی المناک داستان

---

۵۵ Honan

سُن سن کر کلیجہ کانپ اٹھتا۔ دل دھکڑ دھکڑ کرتا۔ اور بدن ٹھرا جاتا ہے۔ یہ ساری داستان تاریخ کے صفحوں پر خونی حروف میں ثبت ہے۔ اور جنگجو قومیں اب بھی اُس سے فوجی اکھڑپن، بے رحمی، سنگدلی اور سفاکی کا سبق سیکھتی ہیں چنگیز خاں کا خوارزم پامال کرنے کا اصلاً ارادہ نہ تھا۔ اِس وقت خوارزم کا سلطان محمد شاہ تھا۔ چنگیز خاں نے اُسے پیغام بھیجا۔ کہ "میں تیری طاقت اور تیری سلطنت کی وسعت جانتا ہوں۔ اور میں تجھے اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں نے چین کو فتح کیا۔ اور اُن تمام قوموں کو زیر کیا ہے۔ جو چین کے شمال میں بستی ہیں۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ میرا ملک جنگجو سپاہیوں کا خزینہ اور چاندی کا دفینہ ہے۔ اِس لئے مجھے اب کسی اور ملک کی ضرورت نہیں۔ لیکن اِس قدر بات ضرور ہے کہ ہمیں اور تمہیں اپنی رعایا کی تجارت بڑھانے میں ایک جیسی دلچسپی ہونا چاہیئے"[1] سلطان خوارزم نے یہ پیغام دل و جان سے قبول کیا۔ اور دونو سلطنتوں میں تاجرانہ راہ و رسم کھل گئی۔ اسکے بعد ہی چنگیز خاں نے کچھ تاجر ماورا النہر بھیجے۔ جنہیں اُترار[2] کے گورنر نے جاسوس سمجھ کر تہ تیغ کر دیا۔ چنگیز خاں نے اپنا وفد سلطان خوارزم کے پاس بھیج کر حوالگی گورنر کا مطالبہ کیا۔ لیکن سلطان اپنے وزرا کے بھکائے میں

---

[1] انسائیکلو پیڈیا۔ آرٹیکل چنگیز خاں۔ [2] Otrar

آ گیا۔ اور اُس نے صدر وفد کو قتل کر کے باقی اہل وفد کی داڑھیاں مونڈ دیں۔
اور جلتی پر تیل ڈالا جب چنگیز خاں کو خبر ہوئی کہ سلطان نے اس طرح اپنے آدمیوں
کی حمایت لی۔ تو وہ آگ بھبھوکا ہو گیا۔ اور ۱۲۱۹ء کے موسم بہار میں پہاڑ پر سے
سوتے شیر کی طرح نکل پڑا۔ اُس نے فوج کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ اپنے
ایک بیٹے کی سرکردگی میں خوارزم کے شمال کو روانہ کیا۔ اور دوسرا اپنے دوسرے
بیٹے کے تحت جند کو بھیجا۔ اس دوسری فوج کے مقابلے پر سلطان خوارزم چار لاکھ
لشکر کثیر اور جم غفیر لے کر آ ڈٹا۔ مگر چنگیزی فوج نے ایرانی لشکر الٹ کر پھینک
دیا۔ کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں خوارزمیوں کے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سپاہی
کھیت آئے۔ اور سلطان سمرقند کی طرف دم دبا کر بھاگ گیا۔ چنگیز خاں کی دوسری
فوج نے اترار کا محاصرہ کر کے وہاں کے گورنر اور اس کے ہمراہیوں کو ٹھکانے
لگایا۔ اور پھر سارے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اس طرح اپنے دل
کا غبار نکالا۔ چنگیز خاں خود فوج لے کر بخارا پر جا چڑھا۔ اور اُسے فتح کر کے
لوٹ مار مچائی۔ اور پھر اُسے آگ لگا دی۔ جس شہر میں اتنی چہل پہل ہوتی تھی۔
اب وہاں گدھے کے ہل چل گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب فاتح فوج بخارا سے نکلی
تو وہاں جامع مسجد اور دو ایک شاہی محلوں کے سوا اور کوئی عمارت باقی نہ رہی
تھی۔ بخارا کو اس طرح زمین سے ہموار کر لینے کے بعد چنگیز خاں سمرقند اور بلخ
کی طرف بڑھا اور اُن کو بھی تاخت و تاراج کیا۔ بات اصل میں یہ ہے ۔ کہ

چنگیزی لڑائی کی شطرنج بہت اسلوب سے پھیلا جانتے تھے۔ اور عیش و عشرت کے مارے ہوئے خراسانی کچھ نہ بنا جانتے تھے۔ بس پھر کیا تھا خراسانیوں کے مہرے جا بجا پٹے۔ اور شاہ خوارزم کو وہ شہ آئی کہ بات ہی ہو گیا۔ اب نہ جائے فرار نہ روئے فرار۔ کرے تو کیا کرے۔ ایسا بدحواس ہو کر بھاگا کہ بحرِ اخضر کے کنارے پہنچ کر ہی دم لیا۔ چنگیزیوں نے وہاں بھی اس کا پیچھا کیا۔ مگر بیماری نے شاہ کی لاج رکھ لی۔ اور اُسے زیرِ زمین پہنچا ہی دیا۔ چنگیز خاں کا غصہ ابھی فرو نہ ہوا۔ اُس نے اپنا بیٹا ٹولی[۵۱] خراسان کی طرف روانہ کیا جس نے نیسہ[۵۲] اور مرو[۵۳] کو فتح کر کے لوٹا اور پھر آگ لگا کر جلا دیا۔ یہ کام ختم کر کے ٹولی نیشاپور کی طرف بڑھا۔ وہاں کے لوگ بدقسمتی سے مقابلے پر اڑ گئے۔ اور انھوں نے اُس سے چار روز تک میدان کارزار گرم رکھا۔ آخر نیشاپور بھی سر ہوا اور پھر دیکھتے دیکھتے شہر خموشاں بن گیا۔ چار سو صناعوں کے سوا جن کو منگولیہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ باقی تمام زن و مرد تہ تیغ کیے گئے اور ایک متنفس بھی زندہ نہ بچا۔ جس شہر میں پہلے تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اب وہاں الو بول رہا تھا۔ سلطان کا لڑکا جلال الدین دہلی کی طرف بھاگ گیا چنگیز خاں اُس کا پیچھا کرکے دبائے چلا آیا۔ اور آخر لاہور، پشاور اور

---

[۵۱] Tule [۵۲] Niose [۵۳] Merve

ملک پور کے علاقے پامال کر کے اپنے دارالسلطنت کو لوٹ گیا۔ اسی اثنا میں چنگیز خاں کو خبر ملی کہ ہرات کے لوگوں نے اس کا گورنر قتل کر کے کسی اور کو گورنر بنا لیا ہے۔ اس پر اس نے اہل ہرات کی سرکوبی کے لئے اسی ہزار فوج روانہ کی۔ ہرات پہنچکر فوج نے باہر ڈیرے ڈالدیئے۔ اور شہر کو گھیرے میں رکھ لیا۔ چھ ماہ کے بعد شہر کے فتح ہونے پر جب محاصرہ اٹھا۔ تو فوج دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اور برابر سات دن تک لوگوں کے مال وجان پر دھاوے مارتی۔ تلوار چلاتی۔ اور آگ لگاتی رہی۔ مورخین کہتے ہیں کہ ان دو چار دنوں میں فوج نے فصیل کے اندر سولہ لاکھ آدمی موت کی گود میں سلا دیئے۔ اور جب فوج نے شہر چھوڑا۔ تو تمام گلی کوچے لاشوں سے پٹے پڑے تھے ؎

زندہ کوئی سرکش نہ شمشیر نہ چھوٹا
ثابت کوئی ترکش کوئی رہگیر نہ چھوٹا

خراسان جہاں ہر یوم یوم عید اور ہر شب شب برات ہوتی تھی۔ اب آلام کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ سارے ملک پر کچھ ایسی بیکسی چھائی تھی۔ کہ زمین کا ذرہ ذرہ سوگوار تھا

یہ ہے سیاہہ ان فوجی کارناموں کا جو چنگیز خاں نے اپنی فوجی طاقت کے بل پر دکھائے اور یہ ہے ثبوت اس امر کا کہ جس قوم کا جذبہ عسکریت

اور فوجی نظام اعلیٰ پیمانے پر ہو۔ وہ شجاعت کے جوہر دکھا کر اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کئے دیتی ہے۔ چنگیز خاں کی مدت حیات گو تھوڑی تھی۔ یعنی ۱۱۶۲ء سے ۱۲۲۷ء تک مگر اس نے اور اس کی قوم نے اس تھوڑے سے عرصہ میں اپنی نبرد آزمائیوں اور خون آشامیوں کا وہ مظاہرہ کیا کہ اُس کا ذکر سُن سُن کر قومیں کانپ اٹھتی ہیں۔ اور اب بھی اس کا نام جنگجویانِ دنیا کی فہرست میں چوٹی پر ہے[۵۱]

یہاں بات میں بات نکل آئی۔ وہ بھی سن لیجئے۔ جن دنوں چنگیزی فوج کی بلغار سے نیشاپور کے تمام زن و مرد اور بچے عدم آباد میں جا بسے۔ اُن دنوں شیخ نجم الدین کبریٰ رح، سرِ عسکر سلسلہ کبرویہ وہاں ٹکے ہوئے تھے۔ اُن کا ایک پیارا مرید شیخ مجد الدین بغدادی رح تھا۔ ایک دن شیخ بغدادی رح پر سکر کا غلبہ ہوا۔ آدمی نے آخر کچا دودھ پیا ہے۔ کتنا ہی پہنچا ہوا کیوں نہ ہو۔ پھر بھی اس کی سرشت میں خطا کو کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ اُن کے منہ سے نکل گیا کہ میرا پیر شیخ نجم الدین ایک مرغ طریقت تھا جس نے اپنے پروں کے نیچے میری تربیت کی۔ میں تو انڈے سے نکل کر دریا میں چلا آیا۔ اور شیخ کنارے پر ہی رہا۔ شیخ دریائے تصوف کوہ کمال اور پیکر دانش تھے۔ نور فراست سے تاڑ گئے اور وہیں سے بول اُٹھے کہ ایلو دریا میں جاتا ہے۔ مجد الدین نے جب یہ بات سنی تو انگلیاں دانتوں میں لے کے رہ گئے۔ اور ایک روز جب کہ شیخ کا حال سماع میں خوش ہوا۔ تو آگ کا طشت سر پر رکھے۔ شیخ کے حضور میں ننگے پاؤں صف نغال میں

---

۵۱ ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۴۔ کتاب سوئم۔ باب اوّل۔

دست بستہ آکھڑے ہوئے۔ شیخ پہلے چپکے دیکھا کئے پھر بولے کہ اب عذر چاہتا ہے تو دین و ایمان تو سلامت لے جائے گا۔ مگر تیرا سر جاتا رہے گا۔ اور تیرے سر کے ساتھ ہمارا سر اور سلطان کا سر اور تمام سرداروں کے سر جائینگے۔ اور جہاں خراب ہوگا۔ سلطان خوارزم کی والدہ نہایت حسین تھی۔ وہ شیخ مجدالدین کی زیارت کو جایا کرتی۔ ایک دن سلطان نشے میں تھا۔ کہ کسی بدکیش نے شیخ کی چغلی کھائی اور سلطان کو کہدیا کہ آپ کی والدہ اُن کے نکاح میں آیا چاہتی ہے۔ سلطان غصے سے لال بھبھوکا ہوا۔ اور اُس نے وہیں حکم دیدیا کہ شیخ کو دریا میں ڈبو دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور ولایت کا آفتاب دریا کی چادر میں چھپ گیا۔ لہریں پاؤں میں لوٹ ہونگی۔ پانی کی دنیا نے ان کا جنازہ اتارا ہوگا۔ حشراتِ بحر و بر نے ان کے لئے دعا مغفرت مانگی ہونگی۔ اور بلبلوں نے سطح آب پر آکر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ دکھایا ہوگا۔ کہ آنکھوں والو! ذرا دیکھ تو لو۔ کہ دنیا کس طرح دو دن کا دھوکہ ہے۔ امیر؎

ثبات بحر جہاں میں نہیں کسی کو امیر
اِدھر نمود ہوا اور اُدھر حباب نہ تھا

افسوس! جز و توکل میں مِل گیا۔ قطرہ دریا میں چھپ گیا۔ اور آتش عشق کا جھلسا ہوا دل تو روح پرور فضا میں پہنچ گیا۔ مگر سارے خراسان کو قہر الٰہی کے الاؤ میں جھونک گیا۔ ایک مرد کامل کا ڈوبنا کیا تھا۔ اب تو ساری قوم کے دِل

ڈوبے جاتے ہوئے لگے۔ شیخ کو خبر ہوئی تو سجدے میں گر پڑے۔ سر اٹھایا تو فرمایا کہ میں نے خدا سے التجا کی تھی۔ کہ میرے فرزند کے خون بہا میں سلطان کا ملک لے لیا جائے۔ چنانچہ یہ دعا مستجاب ہو گئی ہے۔ سلطان کو جب یہ خبر لگی تو اس پر گھبراہٹ طاری ہو گیا اور دوڑا دوڑا شیخ کے حضور حاضر ہوا اور ایک طشت میں رکھ کر پیش کیا جس میں ایک تلوار اور کفن رکھا تھا۔ سلطان ننگے سر ننگے پاؤں سامنے کھڑا ہوا۔ اور عرض کرنے لگا کہ اگر خون بہا چاہئے تو یہ زر موجود ہے۔ اور اگر قصاص چاہئے تو یہ تلوار حاضر ہے۔ شیخ بولے کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اس کا خون بہا تیرا ملک اور تیرا سر ہے۔ تیرے سر کے ساتھ ہمارا سر اور بہت سی مخلوق کے سر جائیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا ہے۔ [۵]

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

شیخ ممدوح بھی نیشاپور کی اسی لڑائی میں شہید ہو کر واصل بحق ہوئے۔ سال... خوب مرد تھے۔ امیرے رُخ عرش کی قندیل ہے قد شمع تجلی
اللہ کی قدرت کا تماشہ ہے بشر بھی

---

۵ نفحات الانس جامی رح۔ تذکرہ شیخ نجم الدین کبریٰ۔ مجدالدین بغدادی رح۔

کوئی ساڑھے چھ سو سال ہونے کو آئے کہ چار سو ترکی قبائل کا ایک گروہ دریائے فرات کے اوپر مغرب کی سمت کو چلا جا رہا تھا۔ انکی مسلح فوج مٹھی بھر تھی۔ یعنی چار سو چوالیس سوار سے متجاوز نہ تھی۔ سرداران کا ارطغرل تھا۔ یہ لوگ اشیائے کوچک کے بیچ میں سے گذر رہے تھے۔ کہ ان کی نظر ایک میدان کارزار پر پڑی۔ جہاں دو مقابل فوجوں میں ہنگامہ رستخیز برپا تھا۔ یہ معلوم کئے بغیر ہی کہ یہ جو دو فوجیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ کہاں کی ہیں۔ ارطغرل اور اُس کے ساتھی کمزور جماعت میں جا ملے۔ اور نیزے تان کر دوسری جماعت پر جا گرے۔ اور اُسے بُری طرح مار بھگایا۔ یہ پہلی معرکہ آرائی تھی جس میں ارطغرل کی سرخروئی ہوئی۔ اس قوم کے فوجی کارناموں میں اُس وقت بھی ویسا ہی جنگجویانہ جوش پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ اب پایا جاتا ہے ارطغرل نے جس فریق کی مدد کی۔ وہ سلجوکی ترک الدین سلطان آئی کونیم[1] کی جماعت تھی۔ اور فریق مخالف منگولی تھے۔ جو ترکوں کے جانی دشمن تھے سلطان نے ارطغرل کو اس خدمت کے صلہ میں اشیائے کوچک کا ایک علاقہ دے دیا۔ ارطغرل ۱۲۸۸ء میں مرا اور اس کا بیٹا عثمان اُس کا جانشین ہوا۔ بعد کی عظیم الشان عثمانی ترکی سلطنت کا جانی مبانی یہی عثمان

[1] Iconium

ہے۔ یہ سلطنت ۱۲۸۸ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک یعنی موجودہ جمہوریت کے وجود میں آنے تک قائم رہی۔ یہ ترک ابھی تک اسلام سے ناآشنا تھے۔ اسکی شہر[۵] کے قریب ہی ایک قریہ میں ایک مسلمان شیخ رڈو بیلی[۵] ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک دوشیزہ لڑکی تھی۔ جسے عثمان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ وہ شیخ سے ناطہ کا خواستگار ہوا۔ مگر شیخ نے اُس وقت اُس کی یہ درخواست قبول نہ کی۔ عثمان اندر ہی اندر پروانہ وار جلتا رہا۔ آخر ایک رات اُس نے خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی۔ کہ اُس کی پشت سے اور اُس لڑکی کے بطن سے شاہسواران جہان کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہوگی۔ شیخ نے جب یہ خواب سنا تو جھٹ اپنی لڑکی عثمان کے حبالۂ نکاح میں دیدی۔ شیخ کی سحرآفریں تبلیغ سے عثمان اور اس کی جماعت دایرہ اسلام میں آگئی۔ مورخین کہتے ہیں کہ اسلام کا جس نے عربی۔ پارسی اور بربر اقوام کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ پانسو سال پہلے ہی سیاسی دیوالہ نکل گیا ہوتا۔ اگر اس ترکی قوم نے اپنے قومی نظام سیاسی اور کڑے فوجی ضبط کے طفیل اسلام کے اندر پھر سے نئی روح نئی وحشیانہ زندگی۔ اور نیا جذبۂ عصبیت نہ پھونک دیا ہوتا۔ ترکوں کے دائرہ اسلام میں آنے اور اِس اتحاد سے اسلام میں ایک نئی دنیا پیدا ہوگئی[۵۳]۔"

---

[۵] Eskishahar   [۵] Rdebali

[۵۳] ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۴۔ ص ۳۱۳

عثمان کی مدت حیات میں گو اُس کے ملک نے کچھ زیادہ وسعت نہ پکڑی۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ اُس کی معرکہ آرائی کا سکہ آس پاس کے قبیلوں پر بیٹھ گیا عثمان کے بعد اُس کا بیٹا ارخان تخت پر بیٹھا جو ۱۳۲۶ء سے ۱۳۵۹ء تک حکومت کرتا رہا۔ ارخان کا چھوٹا بھائی الدین ایک بڑے دل گردے کا انسان تھا۔ وہ ضبط و ربط کا پتلا تھا۔ اور طبیعت آئین بند اور اصول تراش لایا تھا۔ اب تک ترکی فوج ننگے دھڑنگے لٹیروں کی ایک جماعت ہوتی تھی۔ اُس نے فوج کی یہ کمزوری محسوس کر کے پہلے پہل رسالہ اور پیادہ فوج کی بنیاد رکھی۔ فوج کو باقاعدہ تنخواہ دینے کا آئین باندھا۔ اور فوجی تعلیم کا ایک اعلےٰ نصاب بھی قائم کیا۔ یورپ میں چارلس ہفتم شاہ فرانس نے کوئی پندرہ کمپنیاں فوج کی بنائیں۔ یہ تاریخ یورپ میں پہلی منظم فوج مانی جاتی ہے اِس سے ایک سو سال پہلے ہی ترکی سپہ سالار الدین نے پہلی باقاعدہ فوج اور رسالہ بنایا۔ اِس سے پہلے اس سلطنت میں کیا ہوتا تھا۔ اور طغرل اور عثمان کو جب فوج کی ضرورت پڑتی۔ تو وہ والینٹروں کو اکٹھا کرتے اور کام ہوئے پیچھے انہیں رخصت کر دیتے تھے۔ الہ دین کی ہوشمندی دیکھیے کہ اُس نے علاوہ اور قوانین ضروریہ کے یہ فوجی قاعدہ بھی باندھا کہ کچھ فوجوں کو تنخواہ کی بجائے مفتوحہ علاقوں میں زمین دی جایا کرے۔ اور اُن کے ذمہ اس علاقہ کی جرنیلی سڑکوں کا بنانا اور مرمت کرنا بھی ہو۔ اِس سپہ سالار نے رسالہ اور

پیادہ فوج کو دو حصوں مستقل اور غیر مستقل میں تقسیم کیا۔ تنخواہ دار رسالہ دو ہزار
چار سو سواروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ جو سلیمان اعظم کے وقت میں چار ہزار تک
پہنچ گیا تھا۔ اس مستقل رسالہ کے علاوہ الہ دین نے ایک رسالہ اور بنایا۔ جسکے
افسر شہزادے اور سردار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک غیر مستقل رسالہ بھی ہوتا
تھا۔ جسے تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اور اس کا گذارہ مال غنیمت پر ہوتا تھا۔ اس رسالہ
کو ضرورت کے وقت بلایا جاتا۔ الہ دین کے اس فوجی نظام کا شہرہ چاروں
طرف عیسائی ممالک میں ہوا اور آس پاس کی قومیں ترکوں سے دبنے
لگیں۔ یہ جنگی ولولہ اور فوجی جذبہ جو الہ دین جیسے ناظم افواج نے ترکی قوم میں
پھونک دیا تھا۔ اس قوم کے عروج کا باعث ہوا۔ اور اسی فوجی نظام کے
طفیل ترکی قوم بڑھتے بڑھتے اس وقت کی تمام قوموں سے سبقت لے گئی۔
الہ دین کی اس فوجی تنظیم کا چھٹتے ہی یہ نتیجہ نکلا کہ ترکوں نے گیلی پولی پر جو
آبنائے دانیال کی کلید سمجھی جاتی ہے قبضہ کر لیا۔

ارخان کے بعد مراد اول تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد حکومت ۱۳۵۹ء
سے ۱۳۸۵ء تک رہا۔ اس زمانے میں ترکوں نے ہلس پانٹ سے بلقان
تک کا سارا علاقہ اپنے زیر نگین کر لیا۔ اور اڈریانوپل اپنا دار السلطنت بنالیا
ترکوں کا بڑھا ہوا حوصلہ دیکھ کر ہنگری۔ سرویہ۔ بوسینیا[1]۔ اور ولاچیہ[2] نے ملکر

---
[1] Bosinia   [2] Wallachia

اُن کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ مگر اس میں ان کو شکست فاش ہوئی۔ اور ڈنیوب[۱] اور اڈریاٹک[۲] کی ساری سلیوونی[۳] قومیں ترکوں کے احاطہ اقتدار میں آگئیں۔ اور قوم کی مرادیں بر آئیں۔

مراد کے بعد بایزید اول (سنہ ۱۳۹۰ء سے ۱۴۰۳ء) سریر آرائے سلطنت ہوا یہ بڑا خونخوار اور کج خلق سلطان تھا۔ اُس نے اپنے بھائی سے وہی سلوک کیا جو اس کے ہمنام نے چشم و چراغ خاندان نبوت سے کیا۔ یعنی اس نے اپنے بھائی کو قتل کروایا۔ اِس کے بعد بھائی کا قتل یا قید کرنا ترکی سلاطین کا شیوہ ہی ہو گیا۔ اِس کے عہد میں تھریس۔ مقدونیہ اور تھسلی فتح ہوئے۔ اور ایشیا کوچک کا بڑا حصہ اور ولاچیہ بھی ان کے زیر نگیں ہو گئے۔

اِس کے بعد مراد دوم۔ محمد دوم۔ بایزید دوئم اور سلیم اول کے عہد حکومت میں بھی کچھ نہ کچھ فتوحات ہوتی رہیں۔ محمد دوئم کے عہد میں ترکوں نے بڑی قربانیوں کے بعد قسطنطنیہ فتح کیا۔ اِس کے علاوہ اور بھی فتوحات کیں۔

سلیمان اوّل (سنہ ۱۵۲۰ء سے ۱۵۶۶ء) کا عہد عثمانی سلطنت کا "زرین عہد" گنا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں ترکی سلطنت اِس قدر پھیلی۔ کہ اِس سے پہلے نہ پھیلی تھی۔ چنانچہ اب اِس سلطنت کے ممالک یہ تھے۔

---

[۳] Slavonies [۲] Adriatic [۱] Denube

(۱) رومیلیا[۱]۔ اِس میں یونان قدیم، مقدونیہ اور تھریس وغیرہ کے علاقے شامل تھے۔

(۲) جزائر آرچی پیلیگو[۲]۔

(۳) ٹرپلی۔ (افریقہ)

(۴) بُودا[۳] (ہنگری کا کچھ حصّہ)

(۵) اناطولیہ (ایشیائے کوچک کا ایک بڑا حصّہ)

(۶) کرمانیہ (ایشیاء کوچک کا ایک حصّہ)

(۷) رُم[۴]۔ (ایشیا رکوچک کا ایک حصّہ)

(۸) سلکدر[۵] (اِس میں کچھ پرانے شہر شامل تھے)

(۹) ٹریبی زند[۶] (بحر اسود کا جنوب مشرقی کنارہ)

(۱۰) ڈائر بیکر[۷]۔

(۱۱) وین[۸]

(۱۲) الیپو[۹]

---

[۱] Rumalia [۲] Archipelago [۳] Buda

[۴] Rum [۵] SalKadr [۶] Trebizond

[۷] Dairbekir [۸] Van [۹] Aleppo

(۱۳) دمشق (شام اور فلسطین)

(۱۴) مصر۔

(۱۵) مکہ معظمہ و مدینہ منورہ۔

(۱۶) الجیریا

(۱۷) تنبیسور[۱]

(۱۸) عدن و یمن۔

(۱۹) بغداد

(۲۰) موصل۔

(۲۱) بصرہ۔

یہ تمام علاقے ترکوں نے فوجی نظام کے بل پر فتح کئے تھے۔ اس سلطان کا عہد عثمانی سلطنت کے کمال عروج کا عہد بھی ہے اور اس کے انحطاط کا بھی۔ اس عہد کے اخیر میں عثمانی دربار اور ترکی قوم میں کچھ ایسی معاشرتی۔ سیاسی اور اقتصادی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ کہ ان سے عثمانی سلطنت کو کچھ ضعف بھی پونچا۔ اور کچھ عرصہ کے لئے زوال بھی آیا۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اس عہد میں فنون لطیفہ کو بھی ترقی ہوئی۔ اور قوم میں دیگر معاشرتی خرابیاں

۱؎ Tennessee

بھی پیدا ہوئیں۔ علوم وفنون جو فاتحوں کے عہد میں ماند پڑ سے جاتے ہیں۔ اس عہد میں چمک اُٹھے تھے۔ خود سلطان سلیمان ایک اچھے پایہ کا شاعر اور فلاسفر تھا۔ اس کا دربار ارباب ناظمان سلطنت کا دربار نہ تھا۔ بلکہ شعرا کا تھا۔ کوئی بارہ درجن شاعر اُس کے دربار کی ظاہری رونق بڑھاتے تھے۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے۔ کہ وہ کس طرح ایک جنگجو سلطان کا پیکر چھوڑ کر ایک آرام طلب سلطان کے کالبد میں آگیا تھا۔ اس کے عہد میں فن تعمیر کو بڑی ترقی ہوئی۔ اور بہت سی عمارتیں بن گئیں۔ مسجدیں۔ کتب خانے۔ مدرسے۔ مسافر خانے وغیرہ بہت بڑی تعداد میں نمودار ہو گئے۔ مورخین نے اس عہد کے ترکی زوال کے جو اسباب قلمبند کئے ہیں۔ اُن کا لب لباب یہ ہے۔

اوّل۔ اس نے اپنے پیشروؤں کے دستور کے خلاف رعایا کی عرض معروض سننے کے لئے دیوان عام میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اپنے حرم کی چار دیواری میں گھرا رہتا تھا۔

دوئم۔ اُس نے اپنے منظور نظر فرمایہ لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں سے رکھے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ترکی دربار جو اس سے پہلے سرکش قوموں کو تہ و بالا کرنے پر طیار رہتا تھا۔ اب خود ہی گھر کی سازشوں سے تہ و بالا ہو گیا تھا۔

سوئم۔ اس عہد میں انا شد کرشی حکومت میں بہت بڑا دخل ہو گیا تھا۔

خود سلطان کی چہیتی ملکہ نے ولیعہد سلطنت اور وزرا دربار کو مروا ڈالا تھا۔ یہ ولیعہد دوسری ملکہ کے بطن سے تھا۔ سلطان اس وقت آٹے کی آپا اور پتھر کی مورت بنا ہوا تھا۔ بیگم جو چاہتی کرتی۔ سلطان کا نام فقط آڑ تھا۔

چہارم۔ اس کی ملکہ کے مقرر کردہ دستور اعظم رستم پاشا کے عہد وزارت میں رشوت ستانی کا بازار اس قدر گرم ہو گیا تھا۔ کہ گورنروں کے عہدے بھی بکتے تھے۔ ان عہدوں کا حق العوض سمیٹنے کو گورنر رعایا پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھایا کرتے۔

پنجم۔ سلطان خود جو کچھ تھا۔ تھا۔ مگر اس کے تمام درباری بھی آرام طلبی اور عیش کیشی کی رو میں بہ گئے تھے۔

ششم۔ میگساری اب عثمانی دربار کا لازمہ قرار پا چکی تھی۔ ملک پر شراب ایسی چھا گئی تھی۔ کہ اس پر قصیدے کہے جاتے اور اس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ گویا حکومت کی دکان تو اب بیٹھی جاتی تھی۔ اور شراب کی دکانیں اونچی ہوئی جاتی تھیں۔ امیر ؎

زینتیں مے کی دوکانوں کی خداداد ہوئیں
اڑ چلیں بوتلیں ایسی کہ پریزاد ہوئیں

ہفتم۔ اس سلطنت کا یہ دستور تھا۔ کہ ایک خاص حصّہ فوج کی باگ ڈور سلطان وقت کے اپنے ہاتھ میں ہوتی۔ اور وہ خود اس کی کمان کرتا۔ سلطان

سلیمان نے اِس قاعدے کو اڑا دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں کاہلی اور سستی کا دور دورہ ہوا۔ اور اس سے ان کے فوجی نظام کو بے حد دھکا لگا۔[1] یہ سلطان تو تھا واقعی سلیمان۔ اس نے بے شک بہت سے ملک سر کر لیے۔ اور اپنی انگشتری کے نگینے میں دھر لئے تھے۔ اور جگہ جگہ کے سورما سپاہی اور بہادر کیا قوت کے دھنی دیو جن بھی اپنے زیر اثر کر لئے تھے۔ لیکن اب جبکہ اِس کا ضبط و ربط ڈھیلا ہونے لگا تھا۔ تو اس کی حکومت کی انگشتری بھی اُس کی انگلی میں ڈھیلی ہو چلی تھی۔ اور اس کا تخت جو اب تک ہوا کے غرور پر اڑا جاتا تھا۔ پریوں کے جھرمٹ سے گھر گیا تھا اور بلقیس صبا نے جس نے کہ اب سلطانہ کی شکل میں جنم لیا تھا۔ اس پر اپنے حسن کا جادو ڈال رکھا تھا۔ ع

عیاں ہے تخت پہ پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا

اِس سے عیاں ہے کہ قوم فوجی نظام کے بل پر ہی زیادہ شاہراہ ترقی پر گام زن ہوتی ہے۔ اور پھر اس نظام میں فرق آنے سے ہی اس کے اقتدار میں فرق آنے لگتا ہے۔ خواہ یہ فرق تھوڑے عرصے کے لئے ہو۔ خواہ زیادہ کے لئے۔ قوم کے علو مرتبت کو قائم رکھنا اور اُسے عیش و عشرت کا

---

[1] ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۴۔ کتاب ۳۔ باب ۱ تا ۲ و ۳

گھن نہ لگنے دینا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ سیدھی راہ تیز تلوار کی دھار سے بھی زیادہ باریک ہے۔ اور یہ ایسی اوگھٹ راہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے یکہ تازوں کے مرکب بھی سُم لیتے ہیں۔ یہاں اقوام کو کیا اور افراد کو کیا سمجھ سمجھ کے اور پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہیئے۔ امیر ؎

رکھنا سنبھل سنبھل کے قدم چاہیئے یہاں
دنیا نہیں صراط ہے یوم الورود کی

راجپوت تلوار کے دھنی ہوتے ہیں۔ بجلی کو کوندنا۔ تلوار کو کاٹنا اور راجپوت کو لڑنا کون سکھائے۔ رانا پرتاپ تاریخ میواڑ میں ایک مشہور شخص گذرا ہے۔ یہ خاندان اودے پور کا ستارہ آسمان شہرت پر آفتاب بن کر چمکا۔ اور اسکے روشن نام کی کرنیں دور دور تک پہنچیں۔ اس نے ہندوستان کی مغل حکومت کے ساتھ لڑائی ڈال کر اپنی قوم کا بان رکھ لیا۔ اکبر اعظم ہندوستان کا سب سے نامور شہنشاہ گذرا ہے۔ اُس کے اقبال کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔ جہاں اس کی تلوار کام کرتی۔ وہاں اسی سے کام لیتا۔ اور جہاں حکمت عملی چلتی۔ وہاں ویسے ہی ڈھنگ ڈالتا۔ اس نے تالیف قلوب کے سب داؤں بھی کھیلے اور وقت پر تلواریں بھی چلائیں اور ضرورت پڑے پر اپنے نئے دین کا منتر بھی پھونکا۔ گویا یہ کہنا چاہیئے۔ کہ اس کا دین و مذہب اسکے جذبات اسکے خیالات سب ملک گیری کے فن میں فنا ہو چکے تھے۔ اُس نے سوچا کہ ہندوستان

ہیں انکی حکومت اجنبی حکومت ہے۔ اور ایسی حکومت سے لوگوں کو کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کیا خوب ہو کہ وہ سب کے ساتھ اپنایت کی راہ میں ہو۔ چنانچہ اس نے اسی لیے مشہور مشہور راجپوت خاندانوں سے رشتہ یگانگت جوڑا۔ اور اُن کی لڑکیاں بیاہ لیں ۱۵۶۱ء یعنی جلوس اکبری کے پہلے ہی سال مجنوں خاں قاقشال نارنول کا حاکم کر کے بھیجا گیا۔ وہاں شیر شاہ کے غلام حاجی خاں نے اس پر دھاوا بول کر اُسے گھیر لیا۔ جب مجنوں خاں اس طرح کھٹ پٹ پھنسا۔ اور اس کی جان پر بن آئی تو راجہ بھاڑا مل راجہ آمیر جو راج ریت کا جاننے والا اور پرمیت۔ پریم کا پالنے والا تھا۔ عین وقت پر اُس کے آڑے آیا۔ اور اس کی بڑی خاطرداریاں کر کے بڑے اعزاز کے ساتھ دربار اکبری کو روانہ کیا۔ یہی راجہ مان سنگھ کا دادا اور بھگوان داس کا باپ تھا۔ مجنوں خاں نے دربار میں پہنچ کر اکبر سے راجہ مذکور کی عالی ہمتی کے حالات بیان کیے۔ اور راجہ کی بے حد تعریف کی۔ اکبر نے راجہ کو بلوایا۔ اور جب راجہ دربار میں پہنچا۔ تو بادشاہ نے اس کی بڑی عزت کی۔ اور بڑے بڑے انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ اسکے پانچویں سال ہی بھگوان داس اور مان سنگھ باپ بیٹا دونوں دربار اکبری میں داخل ہوئے دوسرے سال یعنی ۱۵۶۲ء میں راجہ بھگوان داس کی بہن اور مان سنگھ کی پھوپھی اکبر کے حبالۂ ازدواج میں آئی اور چنگیزیوں اور راجپوتوں کے درمیان

جو سد سکندری مغائرت کی دکھائی دیتی تھی۔ یک قلم گر گئی۔ اور دونو کھل مِل کر شیرو شکر ہو گئے۔ اب بادشاہ اُن راجپوتوں پر جان و دل سے فدا تھے۔ اور راجپوت بادشاہ پر پروانہ وار نثار۔ راجہ بھاڑامل کے خاندان کے رانا پرتاب کے خاندان کے ساتھ پرانے تعلقات چلے آتے تھے۔ اتفاق کی بات دیکھو کہ راجہ مان سنگھ شولہ پور کی مہم سے واپسی پر اودے پور سے گذرا۔ سنا کہ نزدیک ہی کسی جگہ رانا ہے۔ اُسے پیغام بھیجا کہ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ رانا نے اودے ساگر تک راجہ کا استقبال کر کے جھیل کے کنارے پر ایک پر تکلف دعوت دی۔ راجپوتوں میں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ میزبان خود مہمان کے آگے تھال رکھے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو رانا نے بیماری کا عذر کر بھیجا راجہ تاڑ گئے۔ اور رانا کو کہلا بھیجا کہ میں سمجھ گیا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ رانا نے جواب بھیجا کہ جس نے اپنی پھوپھی ترک سے بیاہ دی۔ اُسکے آگے ایک راجپوت تھال رکھے! راجہ دل ہی دل میں کٹ کر رہ گیا۔ اور اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر نکل پڑا۔ اب رانا بھی پہنچ لیا تھا۔ اِس لئے راجہ اُس کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کہ دیکھنا تمہاری شیخی کر کری نہ ہوئی تو میرا نام بدل دینا۔ کسی نے برابر سے کہدیا۔ کہ ہاں ہاں پھر اپنے پھوپھا کو بھی ذرا ساتھ لانا۔ آخر راجہ نے گھوڑے کو ایڑی دی۔ ادھر رانا پندار کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ جس زمین پر ضیافت تیار ہوئی تھی۔ اُسے ناپاک سمجھ کر کھدوایا۔ دھلوایا گیا۔ جلتی

پر پانی کا چھینٹا دیا۔ اور خود اشنان کرکے کپڑے بدلے۔ بدخواہوں کا ماتھا ٹھنکا
انہوں نے رائی کا پہاڑ بنا کر ذرا ذرا بات اکبر تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے سخت
پیچ و تاب کھائے۔ اور رانا پر فوج کشی کا حکم دیا۔ شہزادہ سلیم کے نام اس
مہم کی سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور مہابت خاں رہبری کے لیئے
ساتھ ہوئے۔ لیکن کہاں رانا اور کہاں اکبر اعظم۔ کہاں پرتاب کی مٹھی بھر
سپاہ اور کہاں اکبر کی انبوہ در انبوہ فوج۔ رانا بچارے کو کیا کسی کو بھی ہند میں
اکبر پر منہ آنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اگرچہ لڑائی کسی طرح برابر کی نہ تھی۔ لیکن جو
نقشہ اس کا مورخوں نے کھینچا ہے۔ اس سے یہ بات ٹپک پڑتی ہے کہ
رانا جس کی رگوں میں راجپوتی خون جوش مار رہا تھا۔ خاندانی غیرت سے
اکبر کے آگے جھکنے نہ دیا۔ جب رانا کو خبر ہوئی کہ اکبری فوج کا دریا بڑے بہاؤ سے
آرہا ہے تو وہ اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو اکٹھا کرکے پہاڑوں کے اندر ایک
کُڈھب مقام پر جم گیا۔ اور خیال کرنے لگا کہ یہ دریا پہاڑوں کی چٹانوں سے
ٹکرا ٹکرا کر خود بخود پھٹ جائے گا۔ اور اُس کے لیئے بچاؤ کا رستہ نکل آئے گا۔
جس مقام پر وہ اترا۔ وہ گھاٹیوں کے بیچوں بیچ درہ کے دہانہ پر واقع تھا۔ اور
چاروں طرف عمودی پہاڑوں کی گردنیں نکلی ہوئیں اور تمام رستوں پر چھائی
ہوئی تھیں۔ یہ مقام ہلدی گھاٹ کہلاتا ہے۔ یہاں دونو فوجیں آمنے سامنے
ہوئیں۔ اور گھمسان کا رن پڑا۔ رانا ایک ہاتھ میں نیزہ اور ایک میں قرمزی

جھنڈا لئے اپنے گھوڑے چیتک پر سوار تھا۔ شہزادہ سلیم ہاتھی پر قلب میں جما تھا۔ رانا نے جو مردانہ جوہر اور سپاہیانہ کرتب اس لڑائی میں دکھائے۔ اس کی کیفیت سن سن کر دل جھومتے ہیں۔ وہ نیزہ تانے فوج کو چیرتا اور الٹتا پلٹتا قلب تک جا پہنچا۔ اور ایسا تاک کر نیزہ مارا کہ شہزادہ کا مہاوت تیر اجل کا شکار ہوا۔ نیزہ سے شہزادہ سلیم کا بھی کام تمام ہو جاتا۔ اگر ہودہ سپر کا کام نہ دیتا اور شہزادہ کو جان بچانا مشکل ہو جاتی۔ اگر ہاتھی بدحواس ہو کر نہ بھاگ نکلتا بس پھر کیا تھا مغل چاروں طرف سے رانا پر ایسے گرے جیسے باز شکار پر گرتا ہے اور وہ رن پڑا کہ الامان طرفین کی تلواروں نے ایسی آگ برسائی کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر کوئلہ ہو گئے۔ ؎

اتنا بلند پر تو تیغ اجل ہوا
مریخ آتشی ہوا آبی زحل ہوا

مولف دربار اکبری اس مضمون کو خوب باندھتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔ کہ "مغل نمک حلال اپنے شہزادے کے بچانے میں اور میواڑ کے سورما اپنے سناپتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے" لڑائی کچھ عرصہ پہلے ترازو رہی۔ پھر اکبری فوج کا پلڑا بھاری ہوا۔ اور رانا فوج میں ایسا گھرا کہ اس کا بچ کر نکلنا محال نظر آتا تھا۔ وہ تین دفعہ نکلا اور تین دفعہ گھرا۔ آخر جھالا وار کے سردار کی مدد سے وہ بچ کر نکلا اور بھاگ گیا

اور اسکی فوج پر شکست پڑی۔ دو مغل سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ اور اس پر گھوڑے ڈالے۔ بیچ میں ایک ندی آتی تھی۔ چیتک ہرن کی طرح چاروں ٹیلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اڑ گیا“ رانا سمجھے ہوئے تھے کہ دشمن اسکے پیچھے مار امار آرہے ہیں۔ اتنے میں کسی نے اس کی بولی میں آواز دی ”او نیلے گھوڑے کے سوار“ رانا نے مڑکر دیکھا تو اس کا بھائی سکٹ سامنے تھا۔ یہ گھر سے خفا ہو کر نکل گیا تھا۔ اور دربار اکبری میں نوکری کرلی تھی۔ جب اس نے بھائی کو بھاگتے اور دو مغلوں کو پیچھا کرتے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ اور اس نے ان دونو کو تہ تیغ کیا۔ دونو بھائی گھوڑوں سے اتر کر گلے ملے۔ رانا کا اترنا تھا کہ چیتک نیچے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ رانا کا ایک آدھ دفعہ اور اکبری فوج سے مقابلہ ہوا وہاں بھی اس نے اپنی تلوار زنی کے ایسے جوہر دکھائے کہ سب نے اس کا لوہا مانا۔ اسیر سے

پہلواں مانتے ہیں دب کے تمہارا لوہا
ہاتھ تلوار کا پڑتا ہے کہ گھن پڑتا ہے

لیکن چونکہ اسکے سپاہی اب کے بھی تھوڑے تھے۔ اس لئے یہاں بھی اس نے دن بھر لڑکر فوج کا ستھراؤ کیا۔ اور خود بھاگ کر جان بچائی۔ یہاں اکبری فوج کی فتح دکھانی مقصود نہیں۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ کس طرح ایک تن واحد اپنی فوجی ذہنیت کی بدولت اوروں کو بھی ساتھ لے

اڑتا۔ اور پھر اپنے مٹھی بھر آدمیوں سے انبوہ در انبوہ فوج سے ٹکر لیتا ہے۔ رانا اکبر سے اگر تنا رہا تو صرف اسی ذہنیت کی بدولت۔ ورنہ یہ کس کا حوصلہ تھا۔ کہ اکبر ایسے شہنشاہ پر منہ آتا۔ اور منہ کی نہ کھاتا۔ اور اس سے اڑتا اور موت کے منہ میں نہ جاتا۔ ہند عتیق کی تاریخ ایسے بہت سے نام پیش کر سکتی ہے۔ رامائن اور مہا بھارت بھی تو ہندیوں کے فوجی ولولہ ہی کی پرانی داستانیں ہیں ؛

ہندوستان کا ملک دنیا بھر میں بے نظیر ہے۔ باغبان قدرت نے جس فیاضی اور فراخ دلی سے اس باغ کی آبیاری کی۔ اور اس کی پتی پتی پھول پھول کیاری کیاری کی خبر داری کی۔ اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ اسکی قدرتی بناوٹ دیکھئے کہ پانی کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ ملک کیا ہے۔ معشوقہ دنیا کے چہرہ پر ایک زلف عنبریں ہے۔ جس کے الجھاؤ نے چہرہ کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور جس کی بوئے خوش نے چاروں طرف طبلہ ہائے عطار کھول دیئے ہیں۔ ملک کیا ہے آسمان دنیا پر عقدِ ثریا ہے۔ جو مغربی قوموں کی آنکھوں کا تارا اور تاروں کی محفل میں ماہ پارہ ہے۔ ملک کیا ہے۔ سونے کا انڈا ہے۔ جو ماکیان قدرت نے پانی کے بیچوں بیچ دے ڈالا ہے۔ اور جس کے حصول کی آرزو نے تمام قوموں کے دماغ میں انڈے بچے دے رکھے ہیں۔ شمال کیطرف نگاہ دوڑاؤ تو قدرت نے ایک ایسی

سدِ سکندری کھڑی کر رکھی ہے۔ جس کا جواب دنیا بھر میں نہیں۔ نہیں نہیں یہ ماہ وش ہند کے چہرے پر کالی زلفیں ہیں۔ جنہوں نے اس چاند کے حسن کو بد بیں آنکھ سے چھپا رکھا ہے۔ یہ پہاڑ کوہِ ہمالیہ کہلاتا ہے۔ اور تمام دنیا کے پہاڑوں سے سربلند ہے۔ اس کی بغل سے ہزاروں چشمے پھوٹتے اور بڑے بڑے دریا بہہ نکلتے ہیں۔ دریا گنگا جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی گودی سے نکلتا۔ اسکی محبت میں سر پھوڑتا اور اس سرزمین کی خاک پاک میں لوٹتا ہوا ہگلی کے قریب پہنچ کر اپنی ہستی مٹا دیتا ہے۔ صانع کی صنعت دیکھئے کہ اسی ایک ملک میں بہشت۔ اعراف اور دوزخ کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ شمال میں کشمیر کا خطہ مینو سواد ہشت بہشت سے پہلو مارتا ہے۔ اس کی تعریف میں شاعروں کے قلم ٹوٹ گئے۔ اور ناشروں کے ذہن کند ہو گئے۔ مگر اب تک کسی کو اس کی تعریف کا منہ نہ ہوا۔ اسکے حسن کو دیکھ دیکھ کر قلم کا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ اور دوات کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اسی ایک ملک میں دنیا بھر کی نعمتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ مگر حیرت کا مقام ہے۔ کہ ان میں سے ایک بھی وہاں کے لوگوں کو نصیب نہیں۔ ہر کام اچھے کیلئے کیا۔ بُرے کے لئے بھی ایک سلیقہ ہونا چاہیئے۔ مگر وہاں کے لوگ اس سلیقہ سے ہی محروم ہیں۔ ؎

جو مجھ پہ گذرتی ہے کبھی دیکھ لے تو بھی پھر دیکھوں کہ رونا تجھے کیونکر نہیں آتا

پنجاب سے ذرا نیچے چلے جاؤ تو وہاں آگ ہی آگ برستی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ جہنم کا تندور تپ رہا ہے۔ پنجاب کا خطہ بھی بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں ایک طرف سے جنت کی، اور دوسری طرف سے دوزخ کی ہوا آتی ہے۔ سرد حصوں میں چلے جاؤ تو جنت کی سی ٹھنڈی ہوا سے دل کو عروج ہوگا۔ اور جو گرم حصوں میں گذرو تو پھر دوزخ کی سی گرم ہوا جھلس ڈالے گی۔ پس یہی ہندوستان کا اعراف ہے۔ یہ تو ہند کی ملکی ہیئت کی صورت ہے۔ اب ذرا اسکی سیاسی حالت بھی دیکھئے۔ یہی تو ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں قدرت نے نشیب و فراز کے اسلوب خوب پھیلا رکھے۔ اور دنیا کو محو حیرت کر رکھا ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کا نقشہ جو ہند نے پیش کیا ہے۔ اسکی نظیر اور کہیں مشکل سے ملے گی۔ اب کی بات رہنے دیجئے۔ ان دنوں تو ساری دنیا میں بے چینی پھیلی ہوئی اور آگ سی لگی ہوئی ہے۔ امیرؔ

ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع
عرصۂ کارزار ہے دُنیا

لیکن بات تو یہ ہے کہ اب تک اس خاک پاک سے سینکڑوں قومیں اٹھیں اور سینکڑوں گریں۔ سینکڑوں بنیں اور سینکڑوں بگڑیں۔ سینکڑوں مریں اور سینکڑوں زندہ ہوئیں۔ اسکی ساری تاریخ قوموں کے عروج وزوال کا ایک

بے بہا گنجینہ ہے اور سمجھ سوچ والوں کے لئے عبرت کا ایک لاجواب خزینہ ہے
تاریخ پر ایک نظر تو ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کے آئینہ دل پر کیا کیا عکس پڑتا
اور پھر کس طرح وہ خود بخود مٹ جاتا ہے۔ تاریخ گیہوں دکھا کر جو نہیں بیچتی۔ اسلئے
یہ صاف صاف بتا دے گی۔ کہ اس کشت زار ہند میں گیہوں کی کیا کیا پالیس
پکیں۔ اور کیا کیا ٹوٹ پڑیں۔ ہند کا عہد عتیق اندھیرے میں ہے۔ اس عہد
کے ساتھ ساتھ ملتا کوروں پانڈوں کا زمانہ ہے۔ جن کا کچھ ذکر اوپر ہو چکا۔
راجہ سری کرشن جی۔ راجہ وشسٹھ۔ راجہ سری رام چندر جی۔ راجہ ہرش چندر
وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے وقت میں صدف ہند سے دُرشہوار بن کر نکلے۔
انکی چمک دمک نے سارے ملک کا حسن چمکایا اور اس کا جوبن نکھارا۔ راجہ
چندر گپت۔ اشوکا۔ بکرماجیت وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے راجے ہو گذرے ہیں۔
جن کا عہد انسانی خوبیوں اور سرفروشیوں کا مجموعہ تھا۔ راجہ بکرماجیت
انصاف کا پتلا تھا۔ اس کے دادگستری کے افسانے اب تک لوگوں کی
زبانوں پر ہیں۔ راجہ جے پال۔ پرتھی راج۔ جے چند اور اس وقت کے دوسرے
راجاؤں۔ مہاراجاؤں کا عہد ہندیوں کے زوال کا زمانہ تھا۔ اسی زمانہ میں
شمالی ہند کی راہ سے حملہ آور آتے رہے۔ اور اپنا الّو سیدھا کرتے رہے
اس عہد میں جیسا کہ اور بھی کہیں کہیں اشارہ کیا گیا ہے۔ قومی زوال کے
تمام اسباب کم و بیش پیدا ہو گئے تھے۔ ہندیوں کا عیش و عشرت میں

پڑنا۔ انکی فوجی ذہنیت میں گھن لگنا۔ اِن سے ملکۂ انصاف کا معدوم ہونا۔ ان میں فنونِ لطیفہ کا رواج پانا۔ ان کے نظام سیاست کا بگڑنا۔ غرضیکہ کوئی بات ایسی نہ تھی جو اپنے اصلی رنگ پر رہی ہو۔ اور کوئی شخص بھی اب ایسا نہ تھا۔ جو بے ہنری کو ہنر نہ سمجھتا۔ اور اپنے بھائی سے خواہ مخواہ نہ الجھتا ہو۔ امیرؔ

عالم میں رواج اب یہ ہوا بے ہنری کا
ہم عیب کے مانند چھپاتے ہیں ہنر آج
بیگانے ہوئے نزع ہیں جتنے تھے یگانے
آنکھیں جو پھریں پھر گئی عالم کی نظر آج

غوریوں۔ غلاموں۔ تغلقوں۔ لودھیوں۔ سوریوں اور چنگیزیوں کا آنا جانا بھی آپ نے کچھ نہ کچھ سُن لیا۔ اگر تفصیلی حالات دیکھنا چاہتے ہو۔ تو ہند کی تاریخ اِس عہد کی ایک دفعہ دیکھ لیجئے گا۔ اور جب دیکھئے گا۔ تو پانچوں اسباب قومی عروج وزوال کے ذہن میں رکھئے گا۔ پھر آپ کو پتہ لگے گا کہ ہند کی سرزمین جیسی زرخیز واقع ہوئی ہے۔ ویسی ہی مردم خیز بھی ہے۔ اِس خاک پاک سے ایسے ایسے نامور اُٹھے۔ جو آسمان شہرت پر آفتاب بن کر چمکے۔ ایسے ایسے ماہ جبین پیدا ہوئے۔ جن کی اٹھان بلا کی تھی۔ اور جن کے چہروں کی روشنی نے اس مہر و ماہ کو ماند کر دیا۔ ایسے ایسے بلند اقبال اٹھے۔ جن کا طالع طالع سکندری سے لڑتا رہا۔ ایسے ایسے شہ زور نکلے جنہوں نے اپنے داؤں پیچ

سے پہلوانانِ زمن کو مات کر دیا۔ ایسے ایسے سپہ سالار پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی دلاوری کا سکہ چار دانگ عالم میں بٹھایا۔ ایسے ایسے حکیم اور منجم اٹھے جنہوں نے آسمان سے تارے اتارے۔ ایسے ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی طبع کے بحر موّاج سے عمدہ عمدہ موتی نکالے۔ اور تار نظم میں پرو دیئے مگر جب یہی لوگ جانے کو آئے تو پھر ایسے گئے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ انکو صیاد اجل نے ایسا تاک تاک کر مارا کہ پھر وہ ہل ہی نہ سکے۔ ان کو موت نے ایسا آغوش میں لیا کہ پھر دونو جہان سے بے خبر سوئے پڑے رہے۔ امیرؔ

خاکی نژاد خاک کے اندر چلے گئے
جس گھر سے آئے تھے پھر اُسی گھر چلے گئے

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار تاجدار نہ تھے۔ بلکہ عیش و عشرت کے علمبردار اور ازمنہ زوال کے پہرہ دار تھے۔ اُن کے ذہن سے قومی عروج و صعود کی تمام باتیں اتر گئی تھیں۔ وہ اوروں کے ہاتھوں میں کاٹھ کی پتلی اور کپڑے کی گڑیا تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے تمام عمر گذاری۔ کھایا پیا۔ عیش کیا اور چلتے ہوئے۔ امیرؔ

بے خودی سے ہمیں یہ حال نہ تا زیست کھلا
ایک عالم میں رہے ہم کہ دو عالم میں رہے

ان بگڑے ہوئے چنگیزیوں کے بعد باری مغربی قوموں کی آئی یہ قومیں

عرصہ تک آپس میں چھری کٹاری رہیں اور آخر کو جب اہل انگلستان کا پلڑا بھاری ہوا، تو پھر سرزمین ہند کی ترازوئے انصاف انکے ہاتھ میں دیدی گئی۔ یہ لوگ آئے تو تھے ایک چھوٹے سے جزیرے سے۔ مگر ولولے اور ارادے بہت بڑے ساتھ لائے تھے۔ یہ لوگ اپنی گزبھر زمین میں قدرت کی قہرمانی قوتوں کا خوب مقابلہ کرتے۔ اور زمانے کا گرم سرد سہتے رہے۔ اس لئے ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے۔ جو ایک بلند اختر قوم میں ہونے چاہئیں۔ ان کا جذبہ عسکریت اعلےٰ پیمانہ پر تھا۔ ان کے یہاں علوم و فنون مفیدہ کے دریا بہتے تھے۔ قوم کو عیش کا گھن نہ لگ سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی غذا سادہ اور زیادہ تر ابلے ہوئے آلوؤں پر مشتمل تھی۔ ان میں انضباط پسندی کا جذبہ بڑھا ہوا۔ اور ان کا نظام سیاست خوب سلجھا ہوا تھا۔ اب ایسی قوم یہاں آکر نہ پنپتی تو پھر کون! خدا کی شان! اس وقت دولت و حشمت انکے قدم لے رہی ہیں۔ عزت و عظمت انکے پاؤں میں لوٹے جاتی ہیں۔ اور سطوت و جبروت انکے سمندِ اقبال کی رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ کیا خوب! امیر؎

کس شان سے بیٹھے ہیں سر بزم وہ آکر
ذرّوں میں ہیں خورشید چکوروں میں قمر آج

نپولین اول (۱۷۶۹ء-۱۸۲۱ء) کا نام بھی جوانمردوں۔ بہادروں اور جنگ آزما سپاہیوں کی فہرست میں ایک نمایاں جگہ پہ ہے۔ یہ ستارہ

افق کارسیکا سے اٹھا۔ اور دیکھتے دیکھتے سارے یورپ پر چھا گیا۔ اس کے فوجی کارناموں سے تاریخ یورپ بھری پڑی ہے۔ نیپولین کی تربیت اسوقت کے فوجی ماحول میں ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے روح فرسا جنگی واقعات ہو گذرے تھے۔ ہر ایک پوچھے گا کہ اس میں اسقدر غیر معمولی جنگی ذہنیت کہاں سے پیدا ہوئی۔ سب سے پہلی بات یہ سمجھنی چاہیئے۔ کہ اس کی فطرت ہی عسکریت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اور قدرت کاملہ نے غیر معمولی فوجی ذہنیت اُس کے کالبد میں ودلعیت کر رکھی تھی۔ دوسری بات یہ تھی۔ کہ اُس کی تعلیم کی ابتدا ہی فوجی سکول میں ہوئی۔ وہ برین[1] کے فوجی سکول میں داخل ہوا۔ اور پھر پیرس کے مشہور ملٹری کالج میں دو سال رہ کر اپنی فوجی تعلیم کی تکمیل کرتا۔ اور توپ خانہ کا کام سیکھتا رہا۔ جنگ کے نئے اصول وطریق پر بورسٹ[2] اور گیبرٹ[3] نے کچھ رسائل لکھے تھے۔ وہ اس کی نظر سے گذرے۔ اور سب سے آخر اُس نے یہ کام کیا کہ ایک مشہور شخص بیرن ڈوٹیل[4] سے شرف تلمذ حاصل کر کے اُس سے توپ خانہ کا عملی کام سیکھا۔ یہ تیسری بات تھی۔ جس سے اسکی طبیعت اور بھی چمک اٹھی۔ چوتھی

---

[1] Brienne [2] Bourcet
[3] Guilbert [4] Baron du Teil

بات یہ تھی کہ وہ پہلی ہی دفعہ مسلک ملازمت میں بحیثیت افسر توپ خانہ منسلک ہوا اور اسکے بعد ۱۷۹۱ء میں لفٹنٹ بن گیا۔ لیکن جب فرانس کی لیجسلیٹو اسمبلی نے اپریل ۱۷۹۲ء میں آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ تو وہ جھٹ کپتان بنا دیا گیا۔ اُن دنوں فرانس میں انقلاب زوروں پر تھا۔ اور آئے دن کے واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ نپولین نے انقلاب کے حق میں کچھ رسائل لکھے۔ جس سے وہ ملک و ملت کا بڑا حامی مشہور ہو گیا عین اس وقت ٹولن[1] کے باشندوں نے ملکی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ایک انگریزی رسالہ بھی اپنی مدد کو منگوا لیا۔ ٹولن کے محاصرے کے لئے توپ خانے کے ایک قابل افسر کی ضرورت پڑی۔ اور قرعہ انتخاب نپولین کے نام پڑا۔ اُس کے دانشمندانہ محاصرے سے ٹولن سر ہوا۔ اور وہ بریگیڈ جنرل بنا دیا گیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں وہ افواج اٹلی کا سپہ سالار بن گیا۔ اس وقت فوج بھوکے ننگوں کی ایک جماعت ہوتی تھی۔ نپولین نے اپنے فوجی ولولہ کے زور سے اس ساری فوج میں ایک نئی روح پھونکدی اور سپاہیوں کے سامنے یہ اعلان کیا۔ کہ بے شک تم بھوکے ہو لیکن میں تو تمہیں دنیا کے زرخیز ترین میدانوں میں لئے جاتا ہوں۔ تمہارے سامنے بڑے دولتمند شہر اور زرخیز صوبے ہیں۔ وہاں عزت و دولت تمہارے

---

[1] Toulon

پاؤں سنگی۔ اس نے اٹلی میں قدم ہی رکھا تھا کہ شاہ سارڈینیہ[۱] کے اوسان جاتے رہے۔
اور اس نے فوراً صلح کر لی۔ پوپ اعظم۔ اور پارمہ[۲]۔ موڈینہ[۳] اور ٹسکنی[۴] کے نوابوں نے بھی
پادرینہ کی سی چال چلی۔ اور خدا خدا کر کے اپنی جان بچالی۔ اس کے بعد اس نے
آسٹرین فوج کو واقعیہ تنگ کر کے اُسے ۱۴ اپریل ۱۷۹۷ء کو ریولی[۵] کے مقام پر شکست
دی۔ اور سسپاڈین[۶] سسلپائن[۷] اور لیگوریا[۸] کی جمہوریتیں بنا کر فرانس کے زیر نگیں کر لیں۔ ۱۷ اکتوبر
۱۷۹۷ء کو کیمپو فارمیو[۹] کا صلحنامہ مرتب ہوا۔ جس کی رو سے فرانس کو بلجیم اور
دریائے رائن کا بایاں کنارہ مل گیا۔ مصر کی مہم جو انگلستان کو ملیامیٹ کرنے کے لئے
اس کے زیر قیادت روانہ ہوئی تھی۔ کامیاب نہ ہوئی۔ اور اسے فرانس کے اندر
سیاسی الجھنیں پڑ جانے کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔ اس نے واپس پہنچتے ہی فرانس
کو بچا لیا۔ جس کے صلے میں وہ دس سال کے لئے ملک کا کونسل بنا دیا گیا۔ نپولین نے
یہاں بھی جدت سے کام لیا۔ اور آئینی حکومت میں کچھ ردوبدل کر کے شخصی حکومت
کی اچھی باتیں لے لیں۔ اور جمہوریت کی کمزوریوں کو چھوڑ دیا۔ انقلاب سے طریق انتخاب

---

۱ Sardina ۲ Parmia
۳ Modena ۴ Tuscany
۵ Rivole ۶ Cispadane
۷ Cisalpine ۸ Leguria ۹ Campo formio

اس قدر عام ہو گیا تھا کہ سول سروس عدالت اور پولیس کے تمام عہدہ دار چن کر لئے جاتے۔ یہ ایک ایسی انتظامی غلطی تھی۔ جس سے بعد کی فرانسیسی گورنمنٹیں پے در پے الٹ جاتی رہیں۔ نپولین نے اس انتخابی اصول کو تبدیل کر کے اسکی جگہ بڑے افسروں اور ماتحت افسروں کی تقرری کا طریقہ رائج کیا۔ اور مجسٹریٹوں کے نامزد کرنے کا اختیار بھی حکومت کو دے دیا۔ اس مرحمہ طریقہ کو سال ہشتم کی آئین کہتے ہیں اس سے ملک صحیح طور پر حکومت کے ماتحت آگیا۔ اور حکومت میں مرکزی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ نظام حکومت فرانسیسیوں کو اس قدر پسند آیا۔ کہ قوم کا منشار اعظم ہی بن گیا۔ اب تک بھی یہی تھوڑی سی تبدیلی سے ملک میں رائج ہے۔

یہاں ہی نپولین کی جدت آفرینیاں اور معرکہ آرائیاں ختم نہ ہوئیں۔ ایلپیز کا پہاڑ کاٹ کر آسٹریا پہنچنا اور ملک کو صلح جوئی پر مجبور کرنا اُسی کا کام تھا۔ ۱۴ ارجون ۱۸۰۰ء کو میرنگو کی فتح حاصل کر کے اس نے اپنے آپکو پھر اٹلی کا مالک جزو کل بنا لیا۔ اور ۱۸ ارمئی ۱۸۰۴ء کو سینٹ کی متفقہ رائے سے وہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ اور اُس نے پوپ اعظم کے ہاتھ سے تاج بھی پہنا۔ ممالک روس پرشیا۔ اور اسپین وغیرہ پر بھی اُس نے یلغاریں کیں۔ انگلستان کو زیر کئے بغیر وہ اپنے آپکو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اسلئے برطانیہ سے اُس کا واٹرلو پر آمنا سامنا ہوا۔ مگر اُسے ناکامی ہوئی اور گرفتار ہو کر سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔

ف Marringo

جہاں اُس نے موت کے آخری دن پورے کیئے۔ اللہ! اللہ! اِس ستارہ کا ریگا کا کہاں وہ عروج و کمال اور کہاں اب اُس کا یہ غروب و زوال۔ صبا ؎

پستی سے اوج خاکِ میں مل کر بدل گیا
ذرّے سے لو نصیب کا اختر بدل گیا

وہ نپولین! وہ شہنشاہِ مغرب۔ وہ بطل یورپ! جس کے نام سے دنیا کانپتی تھی آج یہ ادبار۔ یہ قید۔ یہ تنہائی! خدا جانے کیا کیا تفکرات کا سمندر اس کے دل میں موجیں لیتا ہوگا۔ کیا کیا نشتر اسکے سینے میں لگتے ہونگے۔ کن کن خیالوں پر وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوگا۔ آج خود سنٹ ہیلینا کا جزیرہ اُس کی شان و شوکت کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ اور اس کے در و دیوار سے حسرت برس رہی تھی۔ کل جو زمین اسکے زیر نگین تھی آج اُس کا ذرہ ذرہ اُس کا دشمن ہو رہا تھا۔ کل جو آسمان اُسکے نام پر جھک جاتا تھا آج اس پر آفات کے تیر برسا رہا تھا۔ مگر کیا کرتا۔ دل ہی دل میں سوچتا۔ اندر ہی اندر جلتا بھُلستا۔ اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا۔ ہاں ہاں ایک خیال سہارا دیئے جا رہا تھا کہ تو نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اور تو نے اپنا نام خوب روشن کیا بدعہدی کی تو زمانے نے۔ قصور کیا تو وقت نے۔ کہ کمک کچھ ہی منٹ پیچھے پہنچی۔ مگر اب اُس کا پہنچنا اور نہ پہنچنا برابر تھا۔ اُسکے ساتھی اسکا ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اسکے ہمچشم اس سے آنکھیں پھیر چکے تھے۔ میدان تو سامنے خالی پڑا تھا۔ مگر اسکے لئے زمین تنگ ہو چکی تھی۔ طیور تو اُڑ اُڑا چکے تھے۔ اور باز اشہب پنجرے میں بند کر دیا

کر دیا گیا تھا۔

اس خسرو ان ممالک اس سپہ سالار اعظم کے کارناموں کو دیکھ کر یہ بات ٹپک پڑتی ہے کہ فوجی ولولہ افراد اور اقوام کو ضرور کہیں نہ کہیں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ صرف ایک نپولین نے اپنے جنگی ربط و ضبط اور فوجی ذہنیت کے بل پر سارے یورپ کا رنگ بدل ڈالا۔ قوموں کو تہ و بالا کیا۔ اٹلی۔ آسٹریا۔ روس۔ جرمنی۔ پرشیا۔ بلجیم۔ سپین وغیرہ کو روندا۔ اور کچلا۔ اور آخر چونکہ اسکے سر پر غرور و تکبر کا دیو سوار ہو گیا تھا۔ وہ سر کے بل ایسا گرا کہ اس کا گرنا اُسکے اٹھنے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اور اسکے علاوہ وہ آنے والوں کے لئے دو متضاد باتوں کا ایک جاں پرور سبق چھوڑ گیا۔ وہ سبق کیا؟ وہ یہ کہ افراد میں فوجی ذہنیت کا پیدا ہونا قوم کے عروج کا باعث ہوتا ہے اور خدائے لایزال کی خدائی سے منہ موڑنا اور غرور و تکبر کا جامہ پہننا آخر اس قوم و ملت کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ وہ سر پھر فن دیرینہ ہے جو کسے ایک حالت پر رہنے دیتا ہے۔ جسے آج اٹھاتا ہے۔ اُسے کل ضرور گراتا اور رسوائے عالم کر کے چھوڑتا ہے۔ داغ ؎

گرا ہے زمیں پہ پھینکا گیا ہے زمیں پہ پڑا تھا
مشت غبار اپنا بازیچہ ہے صبا کا

زمانہ کی کچھ رفتار ہی ایسی ہے۔ کہ جو قوم ایک وقت اُٹھتی ہے۔ وہی دوسرے وقت گرتی ہے۔ اور جو ایک وقت گرتی ہے وہی دوسرے وقت پروان چڑھتی

ہے۔ گویا عروج و زوال کی میزان آخر پر جا کر برابر رہتی ہے۔ اور کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اُسے موت و حیات کے ان مراحل سے گذرنا نہیں پڑا۔ منیر ؎

یکساں ہوا اخیر کو انجام جزو و کل
میزاں برابر آئی قلیل و کثیر کی

یہ برابر ازل سے ہوتا رہا ہے۔ اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ قومیں آتی اور جاتی رہیں گی۔ قومیں بنتی اور بگڑتی رہیں گی۔ قومیں مردہ اور زندہ ہوتی رہیں گی۔ مگر اس دنیا کی رونق میں ذرا بھر فرق نہ آئے گا۔ اسیر ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز کس کی ہے
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

اسلام کا عروج و زوال بھی بہت بڑی حد تک اِسی نظام عسکریت کا رہین منت ہے۔ شروع شروع میں مسلمان مٹھی بھر تھے۔ مگر ان کا مذہبی جوش۔ ان کا روحانی اعتقاد۔ اِن کا افلاس۔ ان کا جنگی ولولہ۔ ان کی سادہ زلیست یہ سب باتیں انہیں پھر کمال پر پہونچا کر رہیں۔ ہم نے اوراق گذشتہ میں جا بجا عربوں کی تباہ حیات کا تار پود اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اور یہ جتا دیا ہے کہ عربوں کو شراب خوری زنا کاری۔ زبرپرستی اور غارت گری کی لت پڑی ہوئی تھی۔ اور کہ یہی باتیں اُنکی گراوٹ کا باعث تھیں۔ مگر باوجود اِن سب باتوں کے ان کے جنگی جوش نے برابر اُن کا ساتھ دیا۔ اُن کی اِس حالت کا اندازہ صرف اِس بات سے ہو سکتا

ہے۔ کہ ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے۔ اور پھر یہ خانہ جنگی سالوں میں بھی ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔ جنگ باسوس جو بنی تغلب اور بنی سیشبان کی معرکہ آرائیوں کا ایک مشہور کارنامہ ہے۔ اسی خانہ جنگی کی ایک صورت تھی۔ ان قبیلوں کی ڈھٹائی دیکھیے۔ کہ یہ خانہ جنگی انہوں نے کوئی چالیس سال تک جاری رکھی۔ اور پھر بھی اُن کو مڑک نہ گئی اور ایک دوسرے سے تنتے ہی رہے۔

زمانہ جاہلیت میں ملکہ عسکریت اور جنگی جوشش و خروش کی پشت پر چند باتیں ہوتی تھیں۔ گو اس وقت عربوں کا کوئی مذہبی ضابطہ نہ تھا۔ اور نہ کوئی آسمانی کتاب اُن کے یہاں موجود تھی۔ پھر بھی ایک بات اُن میں ضرور تھی۔ وہ قوم کی آن پر جان دے ڈالتے تھے۔ خاندان کی عزت اُن کا نصب العین تھا۔ اسکی نگہداشت ان کو اس قدر ملحوظ خاطر تھی۔ کہ عورتیں بھی جنگ میں ساتھ رہتیں اور مردوں کے ہلاک ہونے پر خود میدان جنگ میں کود پڑتیں۔ اور اس طرح قوم کی عزت و حرمت کو بٹہ نہ لگنے دیتی تھیں۔

دوسری بات اُن میں یہ تھی۔ کہ اگر ایک قبیلے کا آدمی دوسرے قبیلے کی پناہ میں آجاتا۔ تو اس ذمہ داری کو وہ ایک مقدس فرض سمجھتے۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال تک نثار کر دینے کو طیار رہتے۔

تیسری بات اُن میں یہ تھی۔ کہ وہ قبیلہ کے سردار کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قبیلہ کا سردار وہی ہوتا تھا۔ جو خاندانی شرافت، سیرت، مال و دولت

شجاعت۔ اور عقل میں دوسروں سے برتر ہوتا۔

چوتھی بات یہ تھی کہ عورت کا مرتبہ اُن کے یہاں ایسا بلند نہ تھا۔ جیسا کہ اسلام میں ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ آئین عصمت و حرمت کا پالنا اُن کے جینے مرنے کا سوال تھا۔ وہ اپنی عورتوں کی بے حرمتی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے: جبھی تو اُن میں دختر کشی کی رسم عام تھی۔

پانچویں بات یہ تھی کہ جہاں وہ دوستوں کے دوست تھے۔ وہاں وہ دشمنوں کے دشمن بھی تھے۔ جو شخص اپنے دشمن کو وار کا دست بدست جواب نہ دیتا وہ بزدل سمجھا جاتا تھا۔

چھٹی بات یہ تھی کہ اُن کا گذارہ زیادہ تر لوٹ مار پر تھا۔ اسلئے وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتے کہ دشمن ذرا غافل ہو۔ اور یہ اسے جی کھول کر لوٹیں۔

ساتویں خصوصیت ان میں یہ تھی کہ جنگ و جدال میں پشت دکھانا باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔

آٹھویں بات یہ تھی کہ جنگ و جدال میں لگے رہنا انکے یہاں باعث فخر تھا۔ اس لئے لڑائی میں جان دینا اُن کے لئے مایہ صد افتخار تھا۔ لڑائی میں بھوکے شامل ہونا اور مصیبتوں اور سختیوں پر صبر کرنا اچھا سمجھتے تھے۔ اور صبر کے خیال سے دل کو کڑا کر لیتے۔ اور اپنے مقتولوں پر نہ روتے تھے۔ دوسرے قبیلے کو مقتول کا خون بہا دینا اچھا جانتے تھے اور اس پر کھلے سینوں فخر کرتے تھے ؏

دسویں بات ان میں یہ تھی۔ کہ ستم رسیدہ کی اعانت میں مرنے مارنے پر طیار ہو جایا کرتے تھے۔

آفتاب اسلام جب کوہ فاران سے نکلا۔ تو افق عرب پر جو ظلمت کی گھنگھور گھٹا ئیں چھا رہی تھیں سب دور ہو گئیں۔ اور عربوں میں جو جو بری عادتیں تھیں وہ یک قلم مٹ گئیں۔ قمار بازی۔ زن پرستی۔ شراب خوری۔ غارت گری۔ انتقام گیری۔ دختر کشی۔ اور بدسگالی وغیرہ سب برائیاں ان کے رگ و ریشے سے نکل گئیں۔ اور وہ اسلام میں داخل ہو کر ایسے صاف ہو گئے۔ جیسے کہ کھوٹا سونا کٹھالی میں پڑ کر طلائے احمر بن جاتا ہے اسلام نے عربوں کی سادہ زیست کو چمکا یا۔ بلکہ عسکریت کو بھی چمکایا۔ بلکہ اُسے ضبط و نظم کے ذریعہ بڑھایا۔ اور تمام قبیلوں کو جو آپس میں تنے رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملایا۔ اور اتفاق و اتحاد کا مزا چکھایا۔ ان سب باتوں نے مل ملا کر ان میں وہ فوجی روح پھونک دی کہ آج تک اس کی نظیر ناپید ہے۔ خلیفہ ثانی نے پہلے پہل فوج کا دفتر قائم کیا۔ اور حسب ترتیب کروایا۔ فوج کے دو حصے کئے۔ ایک ریگولر۔ دوسری والنٹیر سلطنت کی ملکی تقسیم کے علاوہ فوجی تقسیم بھی کی مختلف مقامات پر جنگی مرکز قائم کر کے حسب ضرورت فوج بھی مقرر کر دی۔ سپاہیوں کے لئے بارکیں اور گھوڑوں کے لئے اصطبل بنوائے۔ عمدہ گھوڑوں کی نسل کو ترقی دینی شروع کی۔ جنگی مرکزوں پر فوج کے دفاتر بھی قائم کئے جہاں کا غذات اور اجناس رسد وغیرہ موجود رہتے۔ نیز بڑے بڑے شہروں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ سواحل اور سرحدات پر بھی فوج کی کمپنیاں

متعین کر دیں۔ فوجوں کی بھرتی کا رجسٹر نئی مرتب کیا گیا۔ اور اس میں تمام قبائل
عرب کے افراد کے اسامی درج کئے گئے۔ ان میں سے آٹھ دس لاکھ آدمی ہمیشہ
فوج میں ملازم رہتے۔ اور یہ لوگ سب کے سب ہتھیار بند ہوتے تھے۔ انکی تنخواہیں
بھی پہلے سے بڑھا دی گئیں۔ سپاہی کی اقل تنخواہ سالانہ تین سو درہم کر دی۔ اور
افسروں کی تنخواہیں سات ہزار سے دس ہزار درہم تک بڑھا دیں۔ جو فوج جنگ
پر بھیجی جاتی۔ اس کے لئے رسد رسانی کا باقاعدہ انتظام ہوتا اور رسد رسانی کا
ایک مستقل محکمہ زاہرا کے نام سے قائم کر دیا۔ فوج کا صیغہ اس وقت ایسا
منظم ہو گیا تھا کہ اسکی مثال اس وقت کی قوموں میں نہ ملتی تھی۔ فوج کے ساتھ
ایک افسر خزانہ۔ ایک محاسب۔ ایک قاضی اور متعدد مترجم اور طبیب و جراح ہوتے
تھے۔ سپاہیوں کو تیرنے گھوڑے دوڑانے تیر چلانے اور ننگے پاؤں چلنے کی ورزشیں
کرائی جاتی تھیں۔ لڑائی کے وقت فوج مختلف حصوں میں بٹ جاتی۔ اور ہر ایک
حصہ اپنی اپنی جگہ پر جم جاتا۔ وہ حصے یہ تھے۔

قلب۔ درمیان کی فوج۔ مقدمہ۔ آگے کی فوج۔ میمنہ۔ دائیں ہاتھ کی فوج۔ میسرہ
بائیں ہاتھ کی فوج۔ ساقہ۔ پیچھے کی۔ طلیعہ۔ گشت لگانے والی۔ ردء۔ ساقہ کے پیچھے
والی۔ رائد۔ چارہ پانی ڈھونڈنے والی۔ پیدل فوج۔ تیرانداز۔ گھوڑ اسوار۔ اور شتر سوار
ہر ایک سپاہی کو اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ قلعہ پر حملہ کرنے کے
لئے منجنیق کے استعمال کو اس عہد میں بہت ترقی دی گئی۔ رستہ صاف کرنے۔ سڑک

بنانے اور پل باندھنے کا کام بھی فوج سے لیا جاتا۔ جاسوسی اور خبر رسانی کا انتظام بھی خوش اسلوبی سے کیا گیا تھا۔ اس فوجی تنظیم کے ساتھ سادہ خورش۔ سادہ لباس سادہ رہائش۔ سادہ زندگی۔ معاد پر اعتقاد۔ خدا کی ہستی کا اقرار۔ رسالت پر ایمان اور شہادت وغزا کی برکتیں۔ یہ سب باتیں سونے پر سہاگہ کا کام دیتی تھیں۔ اس اسلامی فوج نے جس طرح ایران اور روم کی سلطنتوں کو تہ و بالا کیا۔ اس پر کتب تواریخ شاہد ہیں[۱]۔ جس زمانے میں عرب ایرانیوں کے ساتھ قادسیہ کی جنگ لڑے۔ اُن دنوں ایرانی امیری اور عیش پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کا مقابلہ اُن عربوں کے ساتھ تھا جن کی فوجی تنظیم اور سادہ زیست کی جھلک اوپر دکھائی گئی ہے ان دنوں جنگ کی ابتدا یوں ہوتی تھی۔ کہ ایک طرف سے ایک جنگجو نکلتا۔ اور دوسری طرف سے دوسرا۔ اس جنگ میں ایرانیوں کی طرف سے پہلے پہل جو مرد میدان نکلا۔ اُسکے بدن پر دیبا کی قبا۔ اور ہاتھوں میں طلائی کنگن تھے۔ اور کمر بند زرین تھا۔ اسی سے اُس وقت کے ایرانیوں کے قومی مذاق کا اندازہ لگا لیجئے۔ ایک معمولی سپاہی کو بھلا طلائی کنگنوں کی کیا ضرورت؟ سپاہی کا زیور تو اسکی تلوار ہوتی ہے اس کے تن بدن پر دیبا کی قبا کا ہونا کیا معنی! اس کا لباس تو سادگی اور سپاہیانہ سپرٹ ہونا چاہیے۔ اُسکے کمر بند کا زرین ہونا کیا ضرور! اُس کا زرین کمر بند تو قومی

---

[۱] دیکھو تاریخ طبری۔ فتوح البلدان۔ ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۸۔ الفاروق از علامہ شبلی نعمانی۔

حیات کے تحفظ کا زریں اصول ہونا چاہیئے۔ اِس جنگ میں گو کہ سرزمین ایران نے چیونٹیوں کی طرح فوج اُگل دی تھی۔ مگر مسلمانوں کی نبرد آزمائی اور سپاہگری کی ہوا بندھی ہوئی تھی۔ اور اُن کا رعب اقصائے عالم پر چھایا ہوا تھا۔ اسلئے ایرانیوں کا اُن کے سامنے ٹھیرنا کیسا اور کہاں کا! دو چار ہاتھ کر کے بھاگ نکلے۔ اور گھر پہنچکر ہی دم لیا۔ اِس لڑائی میں مسلمانوں نے ایرانیوں کا پتھراؤ کر دیا۔ اور اسلامی سلطنت کی شان بڑھا دی۔ رومیوں کے ساتھ پہلا معرکہ جو اسلامیوں کا ہوا۔ وہ دمشق پر ہوا۔ دوسرا فحل پر ہوا لیکن معرکہ سے پہلے صلح کی سلسلہ جنبانی رومیوں کیطرف سے ہوئی اور جب حضرت معاذ بن جبل ایلچی بن کر رومیوں کے خیموں میں گئے تو جا بجا رزم میں بزم کا رنگ دیکھا۔ وہاں تو کمخواب اور دیبا زریں پا انداز بچھی ہوئی تھیں اور زرق برق کے عالم سے آنکھوں کو چکا چوند آتی تھی۔ آپ یہ حالت دیکھکر ٹھٹھک گئے اور گھوڑے سے اُترکر زمین پر جا بیٹھے۔ اور بولے کہ میں ایسے فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار کیا گیا ہو بیٹھنا نہیں چاہتا عیسائی بولے کہ زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے۔ اور یہ سب کچھ آپکی عزت کے لئے کیا گیا ہے۔ معاذ غصے سے گھٹنوں کے بل ہو بیٹھے اور بولے کہ جسے تم عزت سمجھے بیٹھے ہو مجھے اسکی کچھ پرواہ نہیں۔ اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے۔ تو مجھ سے بڑھکر خدائے علام کا اور کون غلام ہو سکتا ہے۔ رومی جز بز ہو کر رہ گئے۔ موت ضرور کہتی ہوگی کہ دشمنوں کا کمپ اور یہ تیز کلامی! اب بچ کر کہاں جائے گا۔ مگر حضرت معاذ کی شخصیت

نے رومیوں پر وہ افسوں پڑھا۔ اور انکی باتوں نے وہ اثر کیا کہ گھنٹوں جھومتے رہے۔ اور معاذ موت کا منہ چڑا کر صاف نکل آئے۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ مسلمان کس قدر راست شعاری اور سادگی میں ڈوبے ہوئے تھے اور رومی کس قدر شان و شکوہ کے دلدادہ تھے۔ رومی دمشق و حمص پر شکست کھا کر سامنے سے اس طرح بھاگے جس طرح چھال سے مکھیاں اڑیں۔ اور سیدھے انطاقیہ پہنچے۔ اور ہرقل سے جا کر کہا کہ عربوں نے سارا شام پامال کر ڈالا ہے۔ ملک کے بچاؤ کے لئے کچھ تدبیر کیا چاہیئے۔ ہرقل بولا کہ عرب طاقت۔ تعداد سامان حرب ہر بات میں تم سے کم ہیں۔ پھر تمہیں کیوں شکست ہوتی ہے۔ سب نے سوچ بچار کے گھوڑے دوڑ لئے۔ مگر ذہن کسی کا نہ لڑا۔ اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔ سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ آخر ایک گرگ کہن ایک پرانا تم بڑھا جسکے پیٹ میں آنت تھی نہ منہ میں دانت اور جو سوکھ سوکھ کر روح مجرد رہ گیا تھا۔ بول اٹھا کہ عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے دن کو روزے رکھتے ہر ایک کیساتھ ایک جیسا برتاؤ کرتے اور برے کاموں سے بچ کر چلتے ہیں۔ ہمارا یہ حال کہ ہم دختر رز سے ہمکنار ہوتے۔ فسق و فجور کی بغلیں جھانکتے۔ اور دوسروں کو تختہ مشق ستم بنائے رکھتے ہیں نتیجہ یہ کہ ان کا ہر کام نیک نیتی اور اخلاص میں ڈوبا ہوتا ہے اور ہمارا ہر کام ان باتوں سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ بڈھے کھوسٹ نے ایک بات ہزار کی کہی۔ اور خدا لگتی کہی۔ آپ ہی بتائیے کہ جن رومیوں کو بری باتوں کی چاٹ لگ گئی تھی۔ ان کی ان سلجھے ہوئے اسلامیوں کے آگے کیا دال گل سکتی تھی۔ رومی زمین آسمان

کے قلابے بھی ملاتے جب بھی اُن کا منہ کالا اور اسلامیوں کا بول بالا تھا۔
بیت المقدس کی فتح جو اسلامیوں کا ایک سنہری کارنامہ ہے۔ عربوں کی سادگی کی فتح تھی جب خلیفہ ثانی رضؓ عیسائیوں کے بلانے پر بیت المقدس پہنچے۔ تو ایک جبہ زیب تن تھا۔ جسمیں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور ایک شتر ساتھ تھا جس پر آدھا سفر آپ نے طے کیا تھا۔ اور آدھا آپکے غلام نے۔ عیسائیوں کی طرز زیست ہی نرالی تھی۔ انکے یہاں تو امارت اور شان و شوکت مخدومیت کا لازمہ سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان اسلامیوں میں سادگی حرّیت اور مساوات کا عالم ہی کچھ اور تھا جسے عیسائی دیکھ دیکھ کر انگشت بدنداں ہوئے عیسائی عالم اور راہب خلیفہ کی شکل و صورت دیکھ کر بھانپ گئے۔ کہ یہ وہی شخص ہے جسکے نام پر فتح بیت المقدس کی خبریں ان کو بزرگان سلف سے پہنچی ہوئی ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ بیت المقدس کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اور فاتح کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اللہ اللہ سادگی۔ راسخ الاعتقادی۔ دلاوری۔ دینداری۔ ہمت۔ عزیمت کون کونسی بات گنی جائے جو اس وقت اسلامیوں کے قدم لے رہی تھیں۔ کہ انکی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ اور خدا کا متبرک گھر اور عیسائی تہذیب کا گہوارہ ہاتھ میں آیا۔ لڑکر لیتا تو بافتیمت بالفیب ہاتھ آتا کہ نہ آتا۔ مگر اتنا ضرور ہوتا کہ عیسائی دنیا ایک دفعہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنا ارمان تو نکال لیتی۔ اتنی جانیں گنوا کر بھی اسلامیوں کے لئے سودا سستا ہوتا تو ہوتا۔ مگر ایک ایک دیندار کا ایک ایک قطرہ خون بھی تو ہزاروں جانوں سے تول تلتا۔ اور پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ سچ پوچھئے تو یہ فتح اسلامیوں کی انکے

عروج کی فتح تھی۔ اور یہ وقت وہ تھا جبکہ تمام اسباب ارتقاء یعنی سادہ زلیست۔ حرّیت و مساوات۔ جذبہ عسکریت۔ نظام سیاست اور انصاف و معدلت نے گھل مل کر انکے لئے ایک ایسی معجون مرکب تیار کردی تھی۔ کہ ان کا ایک ایک فرد قرابادین قدرت کا نادر نسخہ اور قوائے فطرت کا لاجواب مرقعہ تھا۔ خوب اسیر سے

اہل دنیا جمع مقصد سے اٹھاتے ہیں جو لطف
ترک مقصد سے ہمیں حاصل وہ مقصد ہو گیا

اوراق گذشتہ میں اسی حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ جس قوم میں ملکہ عسکریت اور فوجی نظام اعلےٰ پیمانہ پر ہوگا۔ اُسے تعیش سے بالکل بیگانگی ہوگی۔ اور اسمیں اکثر حالات میں مساوات۔ حریت اور معدلت کا ملکہ گھر کئے ہوگا۔ اسکے برعکس جس قوم کا فوجی نظام بگڑا ہوا ہوگا۔ اس قوم کی زندگی تعیش کے رنگ میں رنگی ہوگی۔ اور اسمیں سادگی نام کو نہ ہوگی۔ بلکہ مےخواری اور بدروشی اس کا شعار ہونگے۔ اور اس میں خود غرضی۔ خود پسندی سرمایہ داری اور حکومت شخصی کے جذبات بہت بڑھے ہوئے ہونگے۔ اسلام کا عروج و زوال دنیا والوں کے لئے ایک عجیب کارنامہ عبرت ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ اسلامیوں کے کارنامے افق دنیا پر شعاع آفتاب سے لکھے جانے کے قابل تھے۔ اور ایک وقت اُن پر وہ آیا کہ وہ اپنے ہی کئے پر خود خاک ڈالتے پھرے۔ اسکی ترقی جن باتوں سے وابستہ تھی۔ وہ خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد کافور ہونے لگی تھیں۔ جمہوریت کا رنگ قوم سے اڑے جارہا تھا۔ مساوات مٹ رہی تھی۔ فوجی نظام بگڑتے جارہا تھا۔ ان میں اگلوں کی سی قناعت

غنائے قلبی۔ زہد۔ روحانیت۔ پاکیزگی اور راست شعاری ڈھونڈھے سے بھی نہ ملتی تھی۔ اب اسلامیوں کے ذہن سے یہ بات اُترے جا رہی تھی کہ عملی ناموری۔ جگر گدازی اور سینہ کاری کا ہی دوسرا نام ہے۔ ظفر ؎

نگیں بے سینہ کاوی ناموَر ہو یہ نہیں ممکن
تجھے گر نام کی خواہش ہے کاہش ہونے والی ہے

مگر اب قوم اور ہی رو میں بہے جا رہی تھی۔ اور اس کے شعبہ ہائے زیست سے جوہر حیات رخصت ہو رہا تھا۔ اب روح تو پرواز کر چکی تھی اور کالبد خالی پڑا تھا۔ شاہیں تو اڑ چکا تھا اور پنجرہ خالی رہ گیا تھا۔ یوسف کوچ کر چکا تھا۔ اور زندان خالی ہو گیا تھا۔ ہمارے اوج تو ظالم صیاد کے پنجے میں تھا۔ اور اُلو ایوانِ حکومت کے کنگرے پر بول رہا تھا۔ اب مسلمانوں کے پاس غم واندوہ درد وغم اور بھوک پیاس کے سوا کیا رہ گیا تھا۔ جو امیری کی ٹھاٹھ بنائے رکھتے۔ اسیر ؎

غم واندوہ و حرماں ہیں مصاحب بوریا مسند
فقیری میں میسّر ٹھاٹھ ہے ہم کو امیری کا

قوموں کے جستہ جستہ حالات جس قدر اوپر مذکور ہوئے۔ اُن سے ذیل کی باتیں پایہ ثبوت تک پہنچتی ہیں:۔

اوّل۔ زر وسیم کی ریل پیل بالآخر قوموں کی تباہی کا موجب ہو کر رہتی ہے کیونکہ اس سے قوموں میں سرمایہ داری۔ عیش پرستی اور کج روی کی برائیاں پیدا

ہوتی ہیں۔ جو اُن کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہیں۔

دوئم۔ مال و دولت کی کثرت سے قوم کا نظام عسکریت اور فوجی ربط و ضبط بگڑ جاتا ہے۔ اور چونکہ اُسے تعیش کی چاٹ لگ جاتی ہے۔ اس لئے اس کا فوجی جوش رفتہ رفتہ مٹ جاتا ہے۔

سوئم۔ جن قوموں کے یہاں من برستا ہو۔ اُن کا رُخ ایک نہ ایک وقت حظ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور اُن میں فنون لطیفہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ لوگوں کو محلوں حلقوں۔ باغوں اور دیگر عمارتوں کے بنانے کا شوق دامن گیر ہو جاتا ہے۔ اور وہ مصوری۔ شاعری۔ موسیقی۔ سنگ تراشی۔ بت تراشی۔ تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

چہارم۔ جب قوم مال و دولت میں کھیلنے اور ناز و نعمت میں لوٹنے لگتی ہے تو پھر اُس کے پٹھے بھی بگڑ جاتے ہیں۔ سادہ زندگی قوم میں عنقا ہو جاتی ہے اور عمدہ عمدہ کھانوں پر گر پڑتی۔ نفیس نفیس کپڑوں کی طرف جھک جاتی۔ صنف نازک پر فریفتی اور حیا سوزی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔

پنجم۔ کثرت املاک اور سرمایہ داری سے قوم کا ملکہ معدلت و داد گستری مفقود ہو جاتا ہے۔ اُس کی استبدادانہ اور جابرانہ کارروایات سے ہمسایہ قوموں کے حقوق پامال ہوتے ہیں ۔

ذیشان بک ڈپو مزنگ لاہور